

بعض تو لکھ پڑھے ہیں خواہ اردو ہی میں لکھے پڑھے ہوں اور بعض ان پڑھے ہیں پہلے طبقہ کے لئے تو تحقیق حق کا طریقہ یہ ہے کہ وہ سب علماء کی کتابیں دیکھیں مگر دونوں کے علماء کی کتابیں خالی الذہن ہو کر انصاف سے دیکھیں۔ پہلے کسی کی طرف داری اور حمایت کا خیال دل میں نہ لائیں کیونکہ اعتقاد کے بعد اس کی ہر بات اچھی معلوم ہوگی اور عیب نظر نہ آئے گا۔ سو تحقیق حق کا یہ طریقہ نہیں بلکہ اس کا طریقہ یہی ہے کہ خالی الذہن ہو کر دونوں کی کتابوں کا مطالعہ انصاف کے ساتھ کیا جائے۔ خدا کے ساتھ معاملہ ہے۔ اس کو پیش نظر رکھ کر دیکھنا چاہیے انشاء اللہ تعالیٰ اگر طلب حق ہے تو بہت جلد آپ کے ذہن میں خود بخود حق واضح ہو جائے گا۔ جب ایک کا حق ہو نا معلوم ہو جائے تو بس اسی سے تعلق رکھو۔ اور اسی سے دین کی باتیں اور خدا کا راستہ دریافت کرو۔ مگر دوسرے کو کبھی برا نہ کہو کیوں کہ کسی کا برا کہنے سے تمہارا کیا بھلا ہو جائے گا بس تم اپنی یہ حالت رکھو۔

۵۔ ہمیشہ ہر پر زخا ہاں منم و خیال ما ہے۔

چشم کہ چشم بدخونہ کر بکسنگا ہے۔

دل آرامیکہ داری دل درد بند و گر چشم از ہمہ عالم فرد بند
اگر کوئی برا بھی ہو تو تم اس کو برا نہ کہو۔ وہ اگر برا ہے۔ تو تم کو کیا۔ اور اگر دوسرا تم کو برا کہے جب بھی تم اسے برا نہ کہو۔ ذوق نے خوب کہا ہے۔

تو بھلا ہے تو برا ہو نہیں سکتا اے ذوق پے برا وہی کہ جو تجھ کو برا جانتا ہے
اگر تو ہی برا ہے تو وہ بچ کہتا ہے۔ پھر برا کہنے سے کیوں سکے برا مانا ہے

یہ طریقہ تو پڑھے لکھوں کے واسطے ہے اور جو بے پڑھے ہوں وہ یہ کریں کہ دو مولویوں کے پاس جا کر ایک

ایک ہفتہ رہیں اور جو وقت ان کی فرصت کا ہو دریافت کرنے سے معلوم ہو جائے گا اس میں ان کے پاس سیٹھیں اور ان کی باتیں سنیں اور دیکھیں جو مسائل متفق علیہ ہیں ان کی پابندی کا کس کو زیادہ اہتمام ہے اور نیز یہ کہ کس کے پاس جا کر کیا اثر ہوتا ہے۔ اگر کسی کے پاس جا کر آخرت کی رغبت پیدا ہو عبادت الہی کا شوق بڑھے اور خدا کی نافرمانی سے دل میں نفرت اور خوف پیدا ہو۔ اور اس کے پاس رہنے والوں کی زیادہ تر حالت اچھی ہو تو

بس اس کو اختیار کر لیں۔ اسی سے ہر بات پوچھا کریں اور اس کی صحبت میں گاہے گاہے آیا جایا کریں اور یہ طریقہ پڑھے لکھوں کو بھی بہت مفید ہے۔ محض کتابوں کے مطالعہ سے کسی عالم کی اصلی حالت ایسی نہیں معلوم ہوتی۔ جیسے پاس رہنے سے معلوم ہوتی ہے۔ اس لئے وہ بھی اگر یہ طریقہ اختیار کریں تو زیادہ بہتر ہے۔ (اسباب الفتنة ص ۵)

(۷۸) بعض لوگ کہتے ہیں کہ روزے صرف تین ہی ہونے چاہئیں، اس کی تشریح!

ایک اشتہار میں نے اپنی آنکھوں سے دیکھا ہے کہ روزے صرف تین ہی ہونے چاہئیں۔ یعنی گیارہویں۔ بارہویں۔ تیرہویں۔ اور اس پر دلیل کیا خوب صورت لائے۔ اس کو بھی سنئے۔ آپ نے یوں استدلال کیا کہ روزے کے بارے میں قرآن میں آیا ہے **اَيَّامًا مَّعْدُودَاتٍ**۔ یعنی چند روز۔ جس کا اصلی مطلب تو یہ ہے کہ ہماری ہمت بڑھانے کے لئے حق تعالیٰ فرماتے ہیں کہ روزہ کے ٹھوڑے ہی دن میں۔ گھر آؤ نہیں۔ مگر آپ نے اس میں یہ اجتہاد کیا کہ حج کے بارہ میں بھی یہی لفظ آیا ہے۔ اَيَّامًا مَّعْدُودَاتٍ اور وہاں اَيَّامًا مَّعْدُودَاتٍ سے ہی گیارہویں، بارہویں۔ تیرہویں۔ تاریخیں مراد ہیں جب وہاں حج میں اَيَّامًا مَّعْدُودَاتٍ سے یہ مراد ہیں تو یہاں صوم میں بھی وہی مراد ہیں۔ کیونکہ۔ القرآن بفسر بعضہ بعضاً۔ حالانکہ القرآن بفسر بعضہ بعضاً کے قاعدہ سے وہاں کام لیا جاتا ہے جہاں ایک آیت کی تفسیر معلوم اور دوسرے کی تفسیر معلوم نہ ہو۔ اور یہاں تو دونوں کی تفسیر الگ الگ معلوم ہے مگر اس اندھے نے تو ایک جگہ کی تفسیر لے لی اور دوسری جگہ کی تفسیر نظر انداز کر دی میں کہتا ہوں کہ اگر اَيَّامًا مَّعْدُودَاتٍ سے بقرینہ دوسری آیت کے گیارہویں، بارہویں، تیرہویں، مراد ہوں تو یہ تاریخیں تو ذی الحجہ کا روزہ رکھنا قرآن سے۔ گیارہویں۔ بارہویں۔ تیرہویں ذی الحجہ کا روزہ رکھنا قرآن سے ثابت ہوگا اور یہی ايام تشریق۔ ان میں روزہ رکھنا اجماعاً بالکل حرام ہے تو قرآن سے ایسے ايام کا روزہ رکھنا فرض ہوگا جس کا روزہ رکھنا اجماعاً بالکل حرام ہے۔ اچھا اجتہاد کیا۔ اور نیز نہیں کہتا ہوں کہ اگر حج اَيَّامًا مَّعْدُودَاتٍ سے بھی گیارہویں، بارہویں۔ تیرہویں۔

مراد ہیں تو یہود نے جو کہا ہے لَنْ تَسْتَنَّا النَّاسَ إِلَّا آتِيًا مَعَهُ وَدَائِبُ كَمْ هُمْ كُودُ زَخٍ مِثْلَ قُورَاسٍ
دن رہنا پڑے گا تو کیا وہاں بھی تین ہی دن مراد ہیں۔ ایمان سے کوئی بتلا دے کہ کیا یہود کی یہی
مراد تھی کہ فقط گیارہویں۔ بارہویں، تیرہویں کو دوزخ میں رہنا پڑے گا۔ اور وہ بھی ذی کبح
ہی ہیں۔ اگر یہاں بھی یہی مراد ہے تو یہ ایسا ہوا کہ جو کالا وہی میرے باپ کا سالا غرض اسی طرح
لوگوں نے فتنے ایجاد کئے ہیں کوئی کہاں تک ان کا اشداد کرے بغیر حکومت کے ہو نہیں سکتا
کوئی سلطنت اسلام کی ہوتی وہ ان کو بند کرتی۔ (اجرا الصیام من غیر انصرام حصول ص ۹)

۷۹) اس شبہ کا جواب کہ تبلیغ عذر سے ساقط

ہوتی ہے یا نہیں

اس کا جواب یہ ہے کہ پہلے آپ امر بالمعروف شروع کر دیں جب کام شروع کر کے کہیں
گاڑی اٹکے گی اس وقت استقذار کر لینا اچھی سے عذار کے حکم دریافت کرنے کا آپ کو حق
نہیں۔ بلکہ اس وقت عذار کا حکم دریافت کرنا گویا جان بچانے کی تدبیریں ڈھونڈنا ہے۔ سب
مسلمان جانتے ہیں کہ شریعت نے طاقت سے زیادہ کوئی حکم نہیں دیا۔ مگر پھر بھی اس قسم
کے عذر کو دوسرے کاموں کی بابت کوئی پیش نہیں کرتا۔ مثلاً وضو بعض دفعہ عذر سے ساقط
ہو جاتا ہے اور نمازیں قیام عذر سے ساقط ہو جاتا ہے مگر جس وقت نماز کے لئے کسی کو کہا
جاتا ہے۔ وہ کبھی یہ نہیں کہتا کہ پہلے مجھے یہ بتلا دو کہ وضو اور قیام کن کن عذروں سے ساقط
ہو جاتا ہے کیونکہ وہاں آپ نماز کے پڑھنے کو ضروری سمجھتے ہیں اور عذر کو عارضی۔ اسی طرح
کھانے میں بھی کسی نے طبیب سے نہیں پوچھا کہ حکیم جی کھانے کے شرائط بتلا دو۔ اور یہ بھی
سمجھا دو کہ کس وقت چھوڑ دیا جائے کیونکہ یہاں بھی کھانے کو ضروری اور نہ کھانے کو عارضی
سمجھا جاتا ہے۔ اسی طرح رمضان میں جو لوگ روزہ رکھتے ہیں وہ کبھی پہلے یہ نہیں پوچھتے
کہ مولوی صاحب روزہ کن کن وجوہ سے ساقط ہو جاتا ہے بلکہ کوئی اگر ایسا سوال کرے
تو اس کی نسبت عام طور پر یہ بدگمانی ہوتی ہے کہ شاید روزہ نہ رکھنے کے ارادے ہیں۔ حسب
آپ کو چاہیے تھا کہ آپ امر بالمعروف شروع کرتے پھر کسی وقت یا وجاہت آدمی کو خلاف

شرع وضع پر نصیحت کرنے یا کافر کو تبلیغ اسلام کرنے میں گاڑی اٹکتی اس وقت مولوی صاحب
سے پوچھتے کہ اس موقع پر کیا کروں یہ کیا کہ آپ نہ حاکم کو امر بالمعروف کریں۔ نہ محکوم کو، نہ مسلم کو
نہ کافر کو۔ نہ بیوی کو۔ نہ اولاد کو، اور پہلے ہی سے لگے عذر کا حکم دریافت کرنے۔ شاید آپ
یہ کہیں کہ نماز روزہ میں تو عذر کم پیش آتے ہیں اور امر بالمعروف میں تو اکثر پیش آتے رہتے
ہیں میں کہتا ہوں کہ یہ خیال غلط ہے۔ اپنے گھر والوں کو امر بالمعروف کرنے میں کون سا عذر مان
ہے۔ بیوی نے نماز پڑھی تھی اس کو نصیحت کرتے میں کیا خوف تھا کیا وہ آپ کو مار ڈالیگی
یا لٹکانا زہنیں پڑھتا تو وہ آپ کا کیا کرے گا اگر آپ کہیں کہ وہ سنتا نہیں ہے۔ تو میں کہتا ہوں
کہ اگر وہ کبھی امتحان میں فیل ہو جائے تو اس وقت اس کو کیوں مارتے ہیں اور کیوں سزا دیتے
ہیں۔ اس وقت وہ آپ کی بات کیونکر سننے لگتا ہے۔ پس یہ سب بہانے لغوی ہیں۔ اصل
بات وہی ہے کہ آپ اس کو ضروری ہی نہیں سمجھتے بھلا اگر آپ کا کوئی دوست آپ کے سامنے
زہر کھانے لگے تو کیا آپ اس کو نہیں روکیں گے یقیناً ہاتھ پیر کر زور سے جھٹکا دیکر زہر کو
اس کے ہاتھ سے لے لیں گے اگر تنہا قادر نہ ہوں گے تو دوسروں کو امداد کے واسطے
بلا لیں گے۔ پھر اس کی کیا وجہ ہے کہ دین میں جو افعال مرض ہیں ان کے روکنے میں اس اہتمام
سے کام نہیں لیا جاتا۔ معلوم ہوا کہ آپ دین کے ضرر کو ضرر نہیں سمجھتے اور یہ سخت مرض ہے
جس کا علاج بالصد ہے۔ مگر افسوس اس قدر غفلت ہے کہ خدا کی پناہ کسی کو بھی اس مرض
کے علاج کی طرف توجہ نہیں۔ الا ماشاء اللہ۔

(تو اسی بالحق حصہ اول)

(۸۰) تبلیغ اسلام کا اسلم طریقہ

ہر ضلع میں ایک مجلس تبلیغ قائم کر دی جاوے جس کا نام وغیرہ رکھنے کی کوئی ضرورت
نہیں۔ نہ عہدہ داروں کے نام مقرر کرنے کی ضرورت ہے۔ کیونکہ آجکل انجمن کے قوانین
اور عہدہ داروں کی فہرست میں تو رجسٹر سیاہ کئے جاتے ہیں۔ مگر کام نہیں ہوتا۔ ہم
کو کام کرنا چاہیے جتنا جس سے ہو سکے بڑے پیانہ کی بھی فکر نہ کر دو چھوٹے ہی پیانہ پر کام
شروع کر دو۔ ہماری حالت یہ ہے کہ یا تو کام کرتے ہیں ٹیپ ٹاپ سے ورنہ کچھ نہیں کرتے

علیکم ورحمۃ اللہ یرمانعت حضور صلی اللہ علیہ وسلم نے اس پر فرمائی۔ ہم اس بارے میں یوں کہتے ہیں کہ مانا اس رخ سے وہی رفع مراد ہے مگر اس سے ایک بات تو ضرور نکلی کہ اصل مطلوب نماز میں سکون ہے اور رفع اس کے خلاف ہے۔ پس مواقع مختلف فیہا میں بھی رفع مقصود نہ ہوگا۔ کیونکہ وہ نماز کی حالت اصلی یعنی سکون کے خلاف ہے۔ اور رفع چونکہ سکون کے موافق ہے اس لئے وہ مقصود ہوگا۔ اسی طرح اور جہاں کہیں اختلاف ہو اے اسی وجہ سے ہوا ہے کہ ایک نے ایک چیز کو مقصود سمجھا اور ایک نے دوسری چیز کو۔

آئین ہیں اختلاف

مثلاً۔ آمین کہنا۔ ایک مجتہد کی رائے یہ ہے کہ مقصود آئین پکار کر کہنا۔ اور اختلاف جو ہوا ہے تو وہ میان جواب کے لئے۔ اور ایک مجتہد کی رائے ہے کہ مقصود اختلاف ہے کیونکہ یہ دعا ہے اور دعائیں اختلاف مقصود ہے اگر پکار کر بھی کہہ دیا ہے تو وہ اس تا کہ معلوم ہو جائے کہ آپ آئین بھی کہا کرتے ہیں اگر بھی پکار کر نہ کہتے تو خبر نہ ہوتی کہ آئین بھی آپ کہا کرتے ہیں جیسے کبھی کبھی حضور صلی اللہ علیہ وسلم نے اسی حکمت کے لئے سری نماز میں ایک آیت پکار کر پڑھ دی ہے تعلیم کی غرض سے ایک مجتہد کی رائے یہ ہے اور ایک کی وہ رائے ہے یہ اختلاف کا ہے سے ہوا۔ اسی وجہ سے کہ ایک نے ایک چیز کو مقصود سمجھا اور دوسرے نے دوسری چیز کو۔ اگر اس کو پیش نظر رکھا جائے تو آپس میں لڑائی جھگڑے ہی کا خاتمہ ہو جائے۔ کس یہ راز ہے اختلاف مجتہدین کا۔ اسی بنا پر تمام افعال میں اختلاف ہوا ہے۔

(احکام المال ص ۲)

(۸۲) درود ابراہیمی علیہ السلام کے افضل ہونیکا
شبہ اور اس کا جواب۔

ایک شہور سوال کا حل یہ ہے کہ اَللّٰهُمَّ صَلِّ مُحَمَّدًا وَعَلٰی اٰلِ مُحَمَّدٍ

کما صلیت علی ابراہیم وعلیٰ آل ابراہیم میں جو صلوة علی رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کو صلوة علی ابراہیم علیہ السلام کے ساتھ تشبیہ دی گئی ہے تو اس پر بعض لوگوں کو شبہ ہوتا ہے۔ صلوة ابراہیمیہ کے افضل واکمل ہونیکا صلوة محمدیہ صلی اللہ علیہ وسلم سے۔ اور نشا اس کا وہی ہے کہ عام طور پر لوگوں نے یہی سمجھ رکھا ہے کہ تشبیہ میں شبہ بہ کا مشبہ سے اقویٰ واکمل ہونا شرط ہے حالانکہ یہ مقدمہ ہی غلط ہے۔ بلکہ صرف اوضح اور اشہر ہونا ضروری ہے افضل واکمل ہونا ضروری نہیں اور اس کی دلیل خود قرآن میں موجود ہے فرماتے ہیں۔ اَللّٰهُمَّ صَلِّ عَلَى النَّبِیِّ وَالْآلِہِ الطَّیِّبِہِ وَسَلَّمَ مِثْلَ صَلَّیْتَ عَلَیْہِمْ کَمِثْلَ صَلَّیْتَ عَلَیْہِمْ مَصْبَحًا۔ اس میں اللہ تعالیٰ نے اپنے نور کو چراغ کے نور سے تشبیہ دی ہے حالانکہ چراغ کے نور کو نور حق سے کیا نسبت مگر بوجہ وضوح کے تشبیہ دی گئی ہے۔ کیونکہ نور مصباح لوگوں کے ذہن پہلے سے حاضر ہے۔

ایک اشکال اور اس کا جواب

اس پر اگر یہ سوال ہو کہ لوگوں کے ذہن میں تو نور شمس و قمر بھی حاضر ہے اور ان دونوں کا نور چراغ کے نور سے زیادہ قوی ہے تو ان کے ساتھ تشبیہ کیوں نہیں دی گئی؟ اس کا جواب یہ ہے کہ سورج اور چاند کا نور اگرچہ چراغ کے نور سے اقویٰ ہے مگر سورج میں ایک عیب یہ ہے کہ اس پر نگاہ نہیں جمتی۔ اس کے ساتھ تشبیہ دی جاتی ہے تو سامعین کو شبہ ہوتا کہ شاید خدا کا نور بھی ایسا ہی ہوگا اس پر نگاہ نہ جم سکے تو جنت میں بھی دیدار سے مایوسی ہوئی اور مرنے سے اس لئے تشبیہ نہیں دی کہ اس کے متعلق یہ بات مشہور ہے کہ نور القمر مستفاد من نور الشمس تو اس کے ساتھ تشبیہ دینے میں اس کا شبہ ہونا کہ نور حق بھی کسی سے مستفاد ہے پھر چراغ میں ایک صفت شمس و قمر سے زیادہ یہ ہے کہ وہ دوسروں کو بھی منور بنا دیتا ہے کہ ایک گھنٹہ میں ایک چراغ سے ایک لاکھ چراغ روشن ہو سکتے ہیں اور اس کے نور میں کچھ کمی نہیں آتی اور شمس و قمر سے دوسروں کو صرف روشنی پہونکتی ہے یہ نہیں ہوتا کہ دوسری شئی نورانی بن کر کسی اور کو بھی منور کر سکے۔ اگر کہا جائے کہ آئینہ آفتاب یا چاند کے

لے شمس آفتاب، قمر چاند، لے روشنی والا۔

سامنے کیا جائے تو وہ خود بھی نورانی ہو جاتا ہے اور دیوار کو بھی منور کر دیتا ہے تو اس کا جواب یہ ہے کہ وہ محض واسطی العرض ہوتا ہے۔ واسطی الثبوت نہیں ہوتا۔ اور چراغ واسطی الثبوت ہو جاتا ہے جیسا کہ نور حق واسطی الثبوت ہوتا ہے مگر یہ تشبیہ من کل وجہ نہیں کہ اس سے نوز بائند دوسرا خدا تصنیف کرنے لگے۔ مطلب صرف یہ کہ نور حق دوسروں کو بھی منور کرتا ہے اور منور بھی ہے گو دوسروں کی تنویر اس درجہ کی نہ ہو۔ اور یہ بات چراغ ہی میں ہے شمس و قمر میں نہیں ہے اور یہ سب نکات ہیں مقاصد نہیں ہیں۔ ہر شئی کو اپنی حد پر رکھنا چاہیے۔

(۸۳) واصل بحق ہونے پر مشبہ

اس پر شاید کسی کو شبہ ہو کہ بارگاہ حق کی تو کہیں انتہا نہیں۔ جیسا کہ مولانا فرماتے ہیں۔

اے برادر بے نہایت درگہست ہرچہ بردے میری برو مانیت
ایک اور عارف کہتے ہیں

نگرد و قطع ہرگز جادۂ عشق از دید نہا۔
کہ می بالذخودایں راہ چوں تاک از برید نہا۔

اور جب اس کی انتہا کہیں نہیں۔ پھر وصول کے کیا معنی کیونکہ وصول تو محدود ہو سکتا ہے غیر محدود تک کہاں ہو سکتا ہے۔ سو اس کا جواب یہ ہے کہ وصول کے دو معنی ہیں ایک وصول محدود ہے ایک غیر محدود ہے۔ تفصیل اس کی یہ ہے کہ تعلق مع اللہ کے دو درجے ہیں ایک سیر الی اللہ ہے تو محدود ہے ایک سیر فی اللہ ہے غیر محدود ہے۔ سیر الی اللہ ہے کہ نفس کا علاج شروع کیا یہاں تک کہ امراض سے شفا ہو گئی اور ذکر و شغل سے قلب کی تعمیر شروع کی یہاں تک کہ وہ انوار ذکر سے معمور ہو گیا یعنی تخلیہ و تخلیہ کے قواعد جان گئے۔ موانع مرقعہ کر دیئے۔ معالجہ امراض سے

۱۔ تخلیہ خالی کرنا تخلیہ آراستہ کرنا

واقف ہو گئے نفس کی اصلاح ہو گئی اخلاق رذیلہ زائل ہو گئے۔ اور اخلاق حمیدہ سے انوار ذکر سے قلب آراستہ ہو گیا۔ اعمال صالحہ کی رغبت طبعیت ثانیہ بن گئی۔ اعمال و عبادات میں سہولت ہو گئی۔ نسبت اور تعلق مع اللہ حاصل ہو گیا۔ تو سیر الی اللہ ختم ہو گئی۔ اس کے بعد سیر فی اللہ شروع ہوتی ہے کہ خدا تعالیٰ کی ذات و صفات کا حسب استعداد انکشاف ہونے لگا۔ تعلق سابق میں ترقی ہوتی۔ اسرار و حالات کا ورود ہونے لگا یہ غیر محدود ہے یہ تعلق ہے جسکی نسبت کہا گیا ہے

بحریت بحر عشق کہ بیچش کنارہ نیست
آنجا جزا نہ کہ جاں بیارند چارہ نیست

اور اس کی ایسی مثال ہے کہ ایک شخص سائنس کا امتحان دیتا ہے یہاں تک کہ پاس ہو گیا اور سند مل گئی تو اس وقت سیر الی سائنس ختم ہوئی اس کے بعد سیر فی سائنس ہے کہ تحقیقات میں اضافہ ہوئی نئی باتیں منکشف ہوں اس کی کوئی حد نہیں چنانچہ اہل سائنس خود اس پر متفق ہیں کہ تحقیقات سائنس کا سلسلہ غیر محدود ہے۔

جب ایک دنیوی تعلق کا یہ حال ہے تو تعلق مع اللہ کا کیا حال ہوگا۔ دوسری مثال اور لیجئے کہ ایک کرہ جو اپنے مرکز سے الگ ہو گیا ہو اور وہ حرکت ایسی کر کے مرکز پر پہنچ جائے تو اس وقت حرکت الی مرکز ختم ہوئی۔ پھر اس کے بعد اپنے مرکز پر پہنچ کر وہ حرکت وضعیہ کرتا ہے اس کی کوئی حد نہیں۔ اسی طرح یہاں سمجھو۔ پس وہ شبہ جاتا رہا کہ جب بارگاہ حق غیر متناہی اور غیر محدود ہے تو وصول کے کیا معنی۔ سو میں نے بتلادیا کہ تعلق مع اللہ ایک معنی کے اعتبار سے محدود ہے۔ یعنی سیر الی اللہ کے اعتبار سے اور اکثر اسی حد پر خلافت دے دی جاتی ہے اور سالک کو مجاز بنایا جاتا ہے۔ جیسے علوم ظاہر میں ایک لفظ خاص کے ختم کرنے پر اور پاس کر لیں پسند دی جاتی ہے یہ محدود ہے پھر آگے عمر بھر علوم میں ترقی ہوتی رہتی ہے یہ غیر محدود ہے ایک درجہ غیر محدود ہے۔ اسی طرح یہاں تعلق کا محدود ہونا بھی صحیح ہے اور غیر محدود ہونا بھی صحیح ہے۔
(غایتہ النجاشی ص ۲۸)

۲۔ راہ خدا طے کرینوالا۔

(۸۴) بعض لوگوں کا بغیر عمل کامل ہو جانے کی تمتنا کرنا غلط ہے

لوگ خاص دین کے باب میں اس کے درپے ہیں کہ اللہ تعالیٰ کے ساتھ ہم کو ایسا شایعہ تعلق ہو جائے کہ حقوق خود بخود ادا ہوتے رہیں۔ ہم کو کچھ کرنا نہ پڑے بس محبت و شوق کا ایسا غلبہ ہو جائے کہ نماز روزہ خود ہی ادا ہوتا رہے۔ سو یہ حالت بغیر اختیاری ہے بندہ کے اختیار میں نہیں۔ بلکہ اس کے ذمہ یہ واجب ہے کہ اپنے ارادہ اختیار سے کام لے اور بغیر اختیاری امور کے درپے نہ ہو۔ یہ بہت ضروری مسئلہ ہے جیسے حدیث میں الطبعی مشغل الاہتمام، وارد ہے اسی طرح میں اس مسئلہ کو نصف السلوک سمجھتا ہوں کہ اختیاری میں کوتاہی نہ کرے اور بغیر اختیاری امور کے درپے نہ ہو۔ لوگوں نے آجکل صرف نماز روزہ کا نام دین رکھ لیا ہے۔ حالانکہ عمل دین کا جزو ہے کہ اختیاری امور کے درپے ہو بغیر اختیاری کے درپے نہ ہو۔ یاد رکھو کہ یہ امور بغیر اختیاری یعنی حالات و کیفیات وغیرہ اگر کبھی حاصل ہوتے ہیں اعمال اختیار یہ ہی میں مشغول ہونے سے حاصل ہوتے ہیں مگر شرط یہ ہے کہ عمل اختیاری سے بغیر اختیاری کی نیت بھی نہ کرے کیونکہ حصول میں تعیل و تاخیر اختیار سے باہر ہے کبھی تو نقصان عمل کی وجہ سے تاخیر ہوتی ہے کبھی قلت استعداد و ضعف استعداد کی وجہ سے دیر ہوتی ہے پس ہم اس کو اللہ تعالیٰ کے سپرد کر دو۔ خود ان کے درپے نہ ہو۔ بلکہ ان اعمال کے درپے ہو جو تمہارے اختیار میں ہیں۔

تو بندگی چوگدایاں بشر طر مد بکن۔
کہ خواجہ خود روش بندہ پروری داند۔

وہ خود جانتے ہیں کہ تمہارے لئے کیا مناسب ہے کیا نہیں اس لئے اگر حالات

لہ پاک و صان رہنا ادھا ایمان ہے۔ لہ تعیل جلدی کرنا تاخیر دیر کرنا

کیفیات تمہارے لئے مناسب ہوں گے عطا کر دیں گے نہیں مناسب ہوں گے تو نہیں عطا کریں گے۔ دیکھو ماں اپنے بچے کے واسطے جو مصلحت سمجھتی ہے وہی کرتی ہے بچہ کی خواہش پر عمل نہیں کرتی۔ خصوصاً باپ کہ وہ بچہ کی حد سے مغلوب ہی نہیں ہوتا۔ ماں تو کسی وقت معلوم بھی ہو جاتی ہے۔ مگر زیادہ حالت یہی ہے کہ والدین بچہ کے ساتھ اپنی رائے کے موافق معاملہ کرتے ہیں جو مصلحت جانتے ہیں ویسا ہی عمل کرتے ہیں گو بچہ کتنا ہی ضد کرے۔ مولانا فرماتے ہیں ص

طفل لى رز زینش اجتمام
مادر مشفق ازاں غم شاد کام
بچہ پچھنے لگانے والے کے شتر وغیرہ کو وغیرہ کو دیکھ کر دتا ہے ڈرتا ہے مگر ماں خوشی کے ساتھ اس کے پچھنے لگواتی ہے کیونکہ اس کی نظر انجام صحت پر ہے تو جب باپ ماں بچوں کی رائے پر کام نہیں کرتے پھر حق تعالیٰ بندوں کی رائے پر کیوں کام کریں۔ اور تم سے مشورہ کیوں لیں۔ وہاں شخصیت ہے پارلیمنٹ نہیں ہے غرض اعمال اختیار یہ میں بھی امور بغیر اختیار کا قصد نہ کرے۔ جو بات اس کے اختیار میں نہیں اس کی طرف التفات ہی نہ کرے۔ بلکہ اپنے کام میں لگے۔
(رفع اللبتاس عن نفع اللباس ص)

(۸۵) بزرگوں کے طریقہ اصلاح پر شبہ کا جواب

بعض لوگ یہ سمجھتے ہیں کہ اس طریقہ سے یعنی طریق اصلاح اختیار کرنے سے معتقد کم ہو جائے گا میں کہتا ہوں اول تو یہ خیال غلط ہے گو ظاہر میں تمہارے پاس آدمی کم آئیں۔ مگر دل میں معتقد زیادہ ہوں گے۔ اور مان لو معتقد کم ہوئے تو کیا فوج بھرتی کر کے کہیں لام رکھیں جو اگر زیادہ معتقد بھی ہوئے اور کام نہ کئے تو ان کو لے کر کیا کر دے۔ اس سے تو یہ اچھا ہے کہ معتقد مقرر ہوئے ہوں اور کام کے ہوں اس میں تو زیادہ راحت ہے کہ جو خلق زیادہ نہ ہو گا۔ کیونکہ ہجوم سے اوقات میں خلل پڑتا ہے۔

یہ جواب تو بطور اخراج عنان کے ہے درمیر اصلی مذاق یہ ہے کہ مجھے تو لوگوں کے

اعتقاد ہی سے وحشت ہوتی ہے۔ مگر جسے ہجوم خلافت سے محبت ہو جو ہر وقت اپنے گرد مجمع چاہتا ہو وہ تو بیشک معتقدین کی قلت سے گھبرائے گا اور وہ طریق اصلاح کو اختیار نہ کرے گا۔ اسی واسطے میں بیعت میں جلدی نہیں کرتا بلکہ بہت سے شرائط کے بعد کرتا ہوں۔ اس میں ہمارے بعض احباب کی رائے یہ ہے کہ اتنی سختی نہ کرنی چاہیے بلکہ جہاں تک ہو سکے لوگوں کو اپنے سے وابستہ کرنا چاہیے۔ میں کہتا ہوں کہ وابستہ کر کے اصلاح کرو تب تو فائدہ بھی ہے ورنہ وہ تو وابستہ ہو کر طریق سے بیکار اور پابستہ ہو جائے گا۔ کیونکہ جلدی بیعت کر لینے سے وہ سمجھے گا کہ اس طریق میں عمل کے اہتمام کی ضرورت نہیں۔ اب بتلاؤ وہ طریق سے پابستہ ہو گیا یا نہیں۔ اور جب اس سے شرطیں کی جائیں گی تو عمل کی ضرورت ابتداء ہی سے اس کے ذہن نشین ہو جائے گی۔ پھر وہ عمل کا اہتمام کرے گا اور بار بار روک ٹوک کرنے سے اس میں ترقی ہوگی۔ اگر وہ روک ٹوک کا تحمل نہ کرنا۔ تو انشا اللہ بہت جلد اصلاح پذیر ہو جائے گا۔ اور بدو اس کے تو فضول بھرتی کرنا ہے۔ غرض اخلاق باطنہ کی حقیقت یہ ہے کہ اعمال باطنہ درست ہوں۔ (المجمعین بین النفعین ص ۲۷)

(۸۶) طاعون سے بھاگنا تدبیر کے خلاف ہے

میں کہتا ہوں کہ بھاگنا دراصل تدبیر ہی نہیں۔ بلکہ سورتدبیر ہے کیونکہ بھاگنا جیسا ضعف قلب سے ناشی ہے اسی طرح وہ ضعف کا منشا بھی ہے۔ یعنی بھاگنے والا اس نفل سے ضعف کو اپنے قلب پر غالب کر لیتا ہے۔ طبی قاعدے سے ایسے امراض ضعیف القلب پر سب سے پہلے قبضہ کر لیتے ہیں۔ تو بھاگنے والے نے تو اسی وقت اپنے اوپر طاعون کو قبضہ دیدیا۔ اگر وہ یہاں نہیں مرا تو دوسری جگہ جا کر مرے گا۔ اب بتلائیے بھاگنا تدبیر کس طرح ہے۔

دوسرے میں کہتا ہوں، اگر بھاگنا مفید بھی ہو۔ اور بھاننے والا طاعون سے بچتا بھی ہو تو تب بھی شریعت کو حق ہے کہ اس مفید نفل سے منع کر دے کیونکہ بعض مفید

افعال سے آپ بھی تو منع کرتے ہیں۔ مثلاً لڑائی میں سے بھاگنا تمام عقلا کے نزدیک جرم ہے حالانکہ یقیناً بھاگنے والے کو تو بھاگنا ہی مفید ہے۔ اس کی جان بچتی ہے مگر اس کو آپ کے لیڈر بھی تدبیر نہیں کہتے۔ بلکہ بے تدبیری کہتے ہیں۔ اسی طرح ہم طاعون سے بھاگنے کو بے تدبیری کہتے ہیں۔ کیونکہ ہمارے نزدیک دلیل شرعی سے طاعون سے بھاگنا ایسا ہی ہے جیسا جنگ سے بھاگنا اور جہاد سے بھاگنا۔ کیونکہ طاعون کی نسبت حدیث میں وارد ہے۔
والفاس منہ منہ الفار منہ الرجف اور ایک حدیث میں طاعون کی حقیقت میں وخزاعا نکم الجن وارد ہے۔ جس سے معلوم ہوا کہ اس وقت جنات کا اور انسانوں کا مقابلہ ہوتا ہے۔ جنات انسانوں کے اندرون جسم میں زخم لگاتے ہیں۔ جس سے طاعون ہوتا ہے۔ اور مقابلہ سے بھاگنا عقلاً بھی بے تدبیری ہے اس لئے شریعت نے فرار کو حرام کر دیا۔ تو اس حقیقت میں اظہار اور ڈاکڑوں کا اختلاف ہے۔ ڈاکڑ جراثیم کو سبب بتلاتے ہیں۔ مگر اس سے مضمون حدیث کی نفی نہیں ہو سکتی کیونکہ یہ ممکن ہے کہ یہ سبب بھی اور وہ بھی۔ مگر اصل سبب و خرج ہو اور ظاہری سبب وہ ہو جو تم کہتے۔ پھر ایک اور بات بھی ہے کہ یہاں سے بھاگ کر جو لوگ دوسری جگہ جاتے ہیں۔ وہ وہاں کے آدمیوں کی نگاہ میں ذلیل ہوتے ہیں۔ اور خصوصاً اگر تم طاعون کی جگہ سے بھاگ کر کسی شہر میں ایسے کسی دوست یا عزیز کے گھر میں بھڑے ہو۔ اور اتفاقاً تمہارے جانے کے بعد اس کے گھر کوئی بیمار پڑ گیا تو اس وقت اس کی نگاہ میں تمہاری ہمت ذلت ہوگی جس کو قرآن سے تم خود بھی سمجھ جاؤ گے کیونکہ وہ یہ سمجھے گا کہ میرے گھر میں تو بیماری نہ تھی۔ یہ کجخت میرے گھر بیماری لے آیا اور اگر وہ بیمار مر گیا تو اسکی موت گھر والوں کے خیال میں تمہارے نامہ اعمال میں درج ہوگی پس ہے ۷

عزیز کے اذدگشس سر تنافت بہر در کہ شدیچ عزت نیافت
پھر اس طرح یہ لوگ دوسری جگہ بھی طاعون پھیلاتے ہیں نہ بطریق عدوی کے بلکہ اسی قاعدہ سے کہ یہ وہاں جا کر لوگوں کے قلوب میں دم پھیلاتے ہیں۔ تو دوسری بستی کے لوگ ان بھاگنے والوں سے یوں کہتے ہیں کہ خدا خیر کرے۔ کہیں ہماری بستی میں بھی

لہ لڑائی۔ لہ اس سے بھاگنے والا میدان کارزار سے بھاگنے والے کی طرح ہے۔ یہ جن کا زخم لگاؤ

طاعون نہ ہو جائے۔ جس سے ان میں بھی قبول طاعون کا مادہ پیدا ہو جاتا ہے۔ تو حضور صلی اللہ علیہ وسلم کی کیسی رحمت ہے کہ آپ نے بھاگنے سے منع نہ فرما دیا۔
(الجمعین بین النفعین ص ۴)

۸۷) منافقین کے نماز جنازہ میں حضرت عمر رضی اللہ عنہ کی رائے کے افضل ہونیکا شبہ اور اس کا جواب!

اس کا جواب یہ ہے کہ حضرت عمر رضی اللہ عنہ کی رائے بھی حضور صلی اللہ علیہ وسلم ہی کی رائے تھی۔ وہ بھی حضور صلی اللہ علیہ وسلم ہی کا فیض تھا کیونکہ کفار و منافقین پر غیظ اور ان سے نفرت حضرت عمر رضی اللہ عنہ کو رسول اللہ ہی کی برکت سے نصیب ہوئی۔ ورنہ آپ کی صحبت سے پہلے تو وہ خود ہی خالی تھے اور قتل رسول کا منصوبہ باندھ کر آئے تھے۔ حضور ص پر ایمان لانے کے بعد حق تعالیٰ نے ان کو کفار و منافقین سے نفرت اور غیظ عطا فرمایا۔ مگر حضرت عمر رضی اللہ عنہ صرف عمر ہی تھے اور حضور صلی اللہ علیہ وسلم رسول بھی تھے اور عمر بھی تھے۔ بلکہ یوں کہو کہ آپ آدم علیہ السلام بھی تھے۔ نوح علیہ السلام بھی تھے۔ ابراہیم علیہ السلام بھی تھے۔ موسیٰ علیہ السلام بھی تھے۔ عیسیٰ علیہ السلام بھی تھے۔

حزب اہل سنت دم عیسیٰ ید بیضا داری آئینہ خوباں ہر ذرہ اند تو تنہا داری

حضور صلی اللہ علیہ وسلم میں تمام شانیں جمع تھیں غیظ و غضب علی الکفار بھی آپ کے اندر تھا اور رحمت و رأفت بھی اعلیٰ درجہ کی آپ میں تھی مگر آپ میں غلبہ رحمت ہی کو تھا۔ اس لئے جب کوئی بہانہ بھی رحمت کا ملتا تھا آپ رحمت ہی کا برتاؤ کرتے تھے جب رحمت کا کوئی بہانہ نہ ہوتا اس وقت غضب فرماتے تھے۔ عبد اللہ بن ابی کوفہ منافق تھا مگر کھلم کھلا کافر نہ تھا۔ اور منافقوں کے احکام کفار معلنین کے احکام سے جدا تھے ان کے ساتھ احکام حیات میں وہی تھا و

ہوتا تھا جو مسلمانوں کے ساتھ کیا جاتا تھا اور موت کے احکام ہنوز نازل نہیں ہوئے تھے۔ اس لئے بوجہ غلبت رحمت کے آپ نے احکام حیات پر قیاس کر کے اس کے ساتھ اموات مسلمین جیسا برتاؤ کیا۔ اور حضرت عمر رضی اللہ عنہ نے بوجہ غلبہ غیظ و شدت کے احکام حیات کو ضرورت و مصلحت پر مبنی سمجھ کر احکامات میں منافقین کو کفار معلنین پر قیاس کیا اور یہ بھی حضور صلی اللہ علیہ وسلم ہی کا فیض تھا اور یہ قیاس بھی آپ سے مخفی نہ تھا۔ مگر حضور صلی اللہ علیہ وسلم نے غلبہ رحمت کی وجہ سے پہلے قیاس کو ترجیح دی کیونکہ جب تک آپ کو موقع ملتا تھا۔ آپ رحمت ہی کے پہلو کو اختیار فرماتے تھے اور حضور صلی اللہ علیہ وسلم کی یہ شان ہم مسلمانوں کے لئے مسہبت کچھ موجب تھی ہے کیونکہ وہ دوستاں را کجا کنی محرم تو کہہ باد شمتاں نظر داری۔

اور

چشم دیوار امت را کہ با شد چوں تو پشتیان
چہ برباک از موج بحران را کہ دارد لوح کشتی بان

اب میں اس مقام پر ایک سوال علماء سے ظاہر کرتا ہوں وہ یہ کہ اَسْتَغْفِرُ لَهُمْ اَوْ لَا تَسْتَغْفِرُ لَهُمْ سے حضور صلی اللہ علیہ وسلم نے تخریر کس طرح سمجھی۔ یہ تردید تو سویر کے لئے ہے کہ ان کے واسطے استغفار کرنا اور نہ کرنا برابر ہے ان کو دعا سے استغفار سے کوئی نفع نہ ہوگا۔ چنانچہ اہل عربیت پر یہ بات مخفی نہیں۔ اسی طرح اِنْ تَسْتَغْفِرْ لَهُمْ سَبْعِينَ مَرَّةً میں عدد کا ذکر تحدید کے لئے محفوظ رہا ہے۔ اگر شتر دنفہ استغفار کر و گے تو مغفرت نہ ہوگی۔ اس سے زیادہ کرو گے تو ہو جائے گی۔ بلکہ یہاں عدد کا ذکر ایسا ہے جیسا محاورہ میں کہا جاتا ہے کہ سو دفعہ بھی کہے گا جب بھی نہ مانوں گا۔ ہزار دفعہ کہے گا جب بھی کچھ نہ ہوگا۔ اس کا یہ مطلب نہیں ہوتا کہ ہزار دفعہ سے زیادہ کہا جائے تو مان لیں گے بلکہ یہ مطلب ہوتا ہے کہ یہ بات ہرگز نہ مانی جائے گی اور عدد کا ذکر صرف بیان کثرت کے لئے ہوتا ہے نہ تحدید کے لئے۔ پھر حضور صلی اللہ علیہ وسلم نے خیبر ت فاختوت و سازید علی

لہ تم ان کے لئے مغفرت چاہو یا نہ چاہو۔

لہ اگرچہ آپ ان کے لئے شتر مرتبہ مغفرت چاہیں۔

السبعین کیسے فرمایا۔ علماء ظاہر اس کا شافی جواب نہیں دے سکتے۔ اور جو لوگ محض ترجمہ قرآن پڑھ کر اجتہاد کے مدعی ہیں وہ تو کیا ہی جواب دیں گے۔ لیکن اب میں علماء باطن کا جواب عرض کرتا ہوں۔ مولانا محمد یعقوب صاحب رحمۃ اللہ علیہ نے اس کا یہ جواب دیا ہے کہ حالت رحمت کے غلبہ کی وجہ سے اس وقت حضور صلی اللہ علیہ وسلم نے معافی کی طرف التفات نہیں فرمایا بلکہ محض نفس الفاظ سے متک فرمانے لگے اور نفس الفاظ میں تخیر و حصر کی گنجائش ضرور ہے گو محاورہ کے اعتبار سے گنجائش نہ ہو۔ اس سے معلوم ہوا کہ غلبہ حال کا ملین پر کبھی ہو جاتا ہے۔ (المربط ص ۳)

۱۸۸) تکمیل نماز کا طریقہ

تکمیل نماز کے لئے مراقبہ موت و مراقبہ تقارر اللہ کا عادی ہونا چاہیے اور میزاق یہ کہتا ہے کہ آیت میں یہ مراد ہے کہ عین نماز کے اندر بھی اس مراقبہ میں قلب کو مشغول کیا جائے جس کی صورت یہ ہے کہ نماز کی ہیئت میں غور کرے کہ میں جو تمام دنیا سے رُخ پھر کر ہاتھ باندھ کر اس طرح کھڑا ہوں کہ نہ کسی سے بات کر سکتا ہوں نہ کسی کی طرف دیکھ سکتا ہوں نہ کھا پی سکتا ہوں اس کی وجہ یہ ہے کہ میں اللہ تعالیٰ کے دربار میں حاضر ہوں اور ان سے عرض معروض کر رہا ہوں۔ پھر قیام کی حالت میں سوچے کہ خدا تعالیٰ کے مجھ پر کس قدر احسانات و انعامات ہیں جن کا شکر یہ میرے ذمہ واجب ہے اور سورہ فاتحہ پڑھتے ہوئے یہ سوچے کہ میں اللہ تعالیٰ کے انعامات کا شکر یہ ادا کر رہا ہوں اور اس کی ربوبیت کا اقرار اور اپنی عبدیت کا اعتراف کر رہا ہوں اور اسی ۔۔۔ عبدیت پر قائم رہنے اور اہل عبدیت کے طریقہ پر چلنے کی دعا کر رہا ہوں اور جو لوگ طریقہ عبدیت سے بہک گئے اور لعنت و غضب کے مستحل ہوں گے ہیں ان کے طریقہ سے بیزاری کا اظہار کر رہا ہوں اور جو قانون الہی تکمیل طریق عبدیت کے لئے نازل ہوا ہے اس پر ہمیشہ کے لئے چلنے کا عہد کر رہا ہوں فاتحہ کے بعد سورت پڑھنے کا یہی مطلب ہے۔

سجدہ و رکوع میں سوچ | پھر جب رکوع میں جائے تو یہ سوچے کہ میری پیدائش اسی مٹی اور زمین سے ہے جو میرے پاؤں تلے ہے

زمین کی خاک سے جیتا جاگتا۔ سمیع و بصیر انسان پیدا ہو جانا محض خالق جل و علی کی قدرت ہے اور جس کی پیدائش زمین کی خاک اور اس کی بنائات وغیرہ سے ہو اس کو عبدیت اور بندگی کے سوا کچھ زیبا نہیں، بڑائی اور بزرگی صرف خالق جل و علا کو زیبا ہے جو تمام عیوب سے بری ہے۔ اسی لئے نمازیں بار بار اللہ کر کہا جاتا ہے کہ اے خدا ہم نے آپ کی عظمت کے سامنے اپنی خیالی عزت کو قربان کر دیا۔ پھر سجدہ میں جاتے ہوئے یہ سوچے کہ مجھے ایک دن زمین کے اندر پیوند ہونا ہے اور اس وقت خدا کے سوا میرا ساتھ دیسے والا کوئی نہ ہوگا۔ دنیا سے میرا نام بھی مٹ جائے گا۔ اور نشان بھی، اس کے بعد دو سجدے میں یہ تصور کر لے کہ گویا میں مرجھا اور خدا سے مل گیا ہوں اب خدا کے سوا میرے ساتھ کوئی نہیں۔

پھر حالت شہد میں سوچے کہ مرنے کے بعد پھر ایک زندگی ہوگی جہاں اسلام اور اعمال و اقوال و احوال صالحہ ہی کام آئیں گے جو اللہ تعالیٰ کے واسطے کئے گئے ہوں اور سیدنا رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم اور جملہ انبیاء و حضرات ملائکہ اور تمام نیک بندوں کی عزت ظاہر ہوگی۔ اور وہ گنہ گاروں کی شفاعت کریں گے لہذا ان پر سلام بھیج کر ان سے تعلق پیدا کرنا چاہیے پھر چونکہ امت محمدیہ کو سیدنا رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے ساتھ سب سے زیادہ تعلق ہے اس لئے اخیر رکعت میں آپ پر خصوصیت کے ساتھ درود پڑھنا چاہیے۔ جب یہ تصور جم جائے تو اس کے بعد جلسہ میں یوں تصور کرے کہ گویا مرنے کے بعد میدان قیامت میں حاضر ہوا ہے۔ اور تمام اعمال و افعال و اقوال جو دنیا میں کئے ہیں اس کے سامنے ہیں جن میں سے وہی کام آئے ہیں جو اللہ تعالیٰ کے واسطے کئے گئے اور رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم اور تمام انبیاء و صلحاء و ملائکہ کی جماعت سامنے ہے جو دربار الہی میں حاضر ہیں۔ ادین ان سب پر درود شریف و سلام بھیج رہا ہوں۔

اور آخر میں اپنے لئے کامیابی و نجات و فلاح کی دعا کر رہا ہوں اور اسی واسطے آیت میں لفظ یظنون اختیار کیا گیا ہے حالانکہ تقارر اللہ کا تو اعتقاد لازم فرض ہے محض ظن کا فی نہیں

مگر چونکہ مقصود یہ ہے کہ نماز میں لقا و شر و رجوع الی اللہ کا استحضار کیا جائے اور یہ استحضار درجہ وقوع میں لازم نہیں بلکہ اس کا ظن اور تصور بھی نمازیں کافی ہے کہ گویا میں اس وقت خدا کے سامنے حاضر ہوں اور مریا ہوں یا مرنے والا ہوں اور گویا میں اس وقت عالم آخرت میں حاضر ہوں اسی واسطے لفظ ظن اختیار کیا گیا۔ اس طرح نماز پڑھنے سے خشوع حاصل ہو جائے گا اور تمام خیالات و وسوسے قلب سے نکل جائیں گے۔ واللہ تعالیٰ اعلم!

ہذا کلہا من سیدی و مرشدی حضرت مولانا خضر احمد صاحب دام فیوضہم۔

(انج ص ۱۸)

(۸۹) چندہ وصول کرنے کے مفاسد -

لوگوں کو سکرٹری وغیرہ صرف اس لئے بنایا جاتا ہے کہ وہ چندہ خوب وصول کرتے ہیں۔ عزنا کے اوپر ٹیکس کی طرح چندہ مقرر کرتے ہیں اور اپنے دباؤ اور اثر سے جبراً وصول کرتے ہیں اس کام میں ان کی مدح کی جاتی ہے کہ فلاں صاحب دین کے کاموں میں بڑی دلچسپی لیتے ہیں سبحان اللہ یہ بڑا دین کا کام کیا کہ عزنا کے گلے پر چھری رکھ کر چندہ وصول کر لیا۔ ان سے اچھے تو وہ لوگ ہیں جو کھلم کھلا ڈاکو ہیں۔ کیونکہ وہ لوگوں سے مال چھین کر اپنے بال بچوں کو تو کھلاتے ہیں جن کا نان و نفقہ ان کے ذمہ واجب ہے تو گوان کا یہ ذریعہ معاش تو حرام ہے مگر صرف ایسا ہے جس میں خرچ کرنا ان کے ذمہ واجب تھا۔ تو وہ حرام کا ارتکاب کر کے ایک واجب سے توسل و تشویش ہوئے اور یہ سکرٹری صاحب حرام طریقہ سے چندہ وصول کر کے ایسی جگہ صرف کرتے ہیں جس کی خدمت ان کے ذمہ واجب بھی نہیں کیونکہ ظاہر ہے کہ انجن کی خدمت ان کے ذمہ واجب نہیں اور ڈاکو کی سزا معلوم ہے تو لوگ اس کے واسطے تیار رہیں۔ انسو اس آج کل چندہ میں اس کا اصل لحاظ نہیں کیا جاتا یہ مال خوشی سے دیا گیا ہے یا جبر سے۔

حق تعالیٰ شانہ نے بیوی کے مال کے بارہ میں بھی فرمایا۔ فَإِنْ طَلَبَ لَكُمْ عَنْ شَيْءٍ مِّنْ نَّفْسِكُمْ لَوْ هِنَا مَرِئًا کہ اگر بیوی اپنے دل کی خوشی سے اپنے

مہر میں سے مرد کو کچھ دیدے تو اس کا کھانا جائز ہے یہاں بھی طیفیس کی قید ہے حالانکہ میاں بیوی کا تعلق عاشقی معشوقی کا تعلق ہوتا ہے۔ اور ایسے تعلق میں ناگواری بھی بہت ہی کم ہوتی ہے تو پھر عزنا بارہ روپیہ بد و ن طیب قلب کے کیونکر جائز ہوگا۔ بیوی کے معاملہ میں ایک مقام پر اس سے بڑھ کر ارشاد فرمایا ہے وَإِنْ طَلَّقَتْهُنَّ مِنْ قَبْلِ أَنْ تَسُوهُنَّ وَكَدَّ خُصْمَتُهُنَّ لَمْ يَكُنْ فَرْصَتَهُنَّ فَخَصْمٌ مَا خُصِمَتْ إِلَّا أَنْ يَعْفُونَ أَوْ يَعْفُوَ الَّذِي بَيْنَهُ عَقْدُ الْكَفَّحِ وَإِنْ تَعَفَوْا آخِرُ بَلَاءٍ لِلتَّقْوَى۔ کہ اگر تم نے اپنی بیوی کو ذنوب سے پہلے طلاق دے دی ہو اور مہر مقرر ہو چکا ہو تو بیوی کے لئے نصف مہر ہے مگر یہ کہ وہ اپنا حق معاف کر دے (تو کچھ نہ رہے گا) یا جس کے ہاتھ میں نکاح کی ڈور ہے (یعنی شوہر) وہ معاف کر دے (تو پورا مہر رہے گا) اور اے مرد تم معاف کر دو تو یہ تقویٰ کے زیادہ قریب ہے یعنی مرد کے لئے زیادہ بہتر ہے کہ عورت کی معافی کا منتظر نہ رہے بلکہ خود اپنا حق معاف کر دے۔ تو دیکھئے کہ باوجودیکہ عورت اگر خوشی سے مہر معاف کر دے تو اس کا قبول کرنا جائز ہے اور اس کی اجازت دیدی گئی تھی مگر اس مقام پر دوسرا ادب کھلا دیا گیا ہے کہ غیرت کا متقاضی یہی ہے کہ عورت کی معافی قبول نہ کر دیکلکہ تم اس کے ساتھ احسان کرو۔

جب بیوی کے ساتھ لین دین کرنے اور اس کا عطیہ قبول کرنے کے لئے یہ آداب ہیں تو کھلا چندہ کے لئے آداب نہ ہوں گے۔ ضرور ہیں اور ان کا لحاظ کرنا واجب ہے۔ شریعت مقدسہ نے تو ہدیہ کے لئے بھی آداب مقرر کئے ہیں چنانچہ ایک ادب یہ ہے مَا تَأْتِيكَ مِنْ غَيْرِ اشْرَافِ نَفْسٍ فَخْذًا، وما لا فلا تتبعہا ففست۔ کہ جو چیز ہدیہ وغیرہ بد و ن انتظار کے آجائے لے لو۔ اور جو انتظار سے آئے اپنے نفس کو اس کے پیچھے مت ڈالو۔ (اصل العبادہ ص ۱۸)

مگر چندہ میں تو قصداً یہ تدبیر کی جاتی ہے کہ مجمع میں تحریک کی جائے تاکہ جو شخص ایک روپیہ دیتا وہ شرمناشرمی (پانچ) روپے تو دے گا۔ یاد رکھو یہ صورت بالکل ناجائز ہے مگر لوگ سمجھتے ہیں کہ اس کے بغیر کام نہیں چلتا۔ میں کہتا ہوں یہ تباہ و مقصود بالذات کیا ہے کام مقصود ہے یا دین؟ اگر صرف کام ہی مقصود ہے تو منافقین درک اسفل میں کیوں ہوں گے۔ کیونکہ وہ بھی توجہ و وسعت وغیرہ کرتے تھے معلوم ہوا کہ جس کام

میں رضاء حق نہ ہو وہ کام ہی نہیں مسلمان کا اصل مقصود رضاء حق ہے چاہے کام تھوڑا ہو مگر رضاء حق کے موافق ہونا چاہیے۔ مثلاً اگر یتیم خانہ بہت بڑا ہو مگر رضاء حق نہ ہو تو اس کو لے کر کیا کرنا ہے۔

ایک انجمن کا واقعہ چنانچہ آجکل جو ایک بہت بڑی انجمن ہے میں اس کا نام بیان کرنا نہیں چاہتا۔ اس کا ایک واقعہ عجیب ہے جس سے حیرت ہو گئی وہ یہ کہ لکھنؤ میں کسی نے بہت جائے داد ایک

متوکل عالم تنگ دست کے سامنے پیش کی کہ اس کو قبول فرما کر اپنے تصرف میں لائیے انہوں نے انکار کر دیا۔ اس کے بعد اس نے انجمن والوں کے سامنے پیش کیا کہ میری طرف سے اس کو انجمن کے واسطے وقف کر دو انہوں نے قبول کر لیا۔ لکھنؤ کے عوام نے اس پر عجیب فقرہ کسا کہ میاں وہ بزرگ تو اکیلے تھے ان کو گناہوں کے انبار کا تحمل نہ تھا اور انجمن میں تو بہت موٹے موٹے ہیں وہ سب مل کر تھوڑا تھوڑا اٹھالیں گے اس واقعہ سے معلوم ہوا کہ ان لوگوں کو صرف انجمن کا چلانا مقصود ہے رضاء حق مقصود نہیں ورنہ حلال و حرام کی ضرور رعایت کرتے۔

حب جاہ اور یہ ساری خرابی حب جاہ کی ہے کہ ان لوگوں کو کام سے مقصود جاہ مطلوب ہے۔ چنانچہ ڈیگ میں ایک نجمن کے سکریٹری مجھ سے ملے اور انجمن سے لوگوں کی بے توجہی کی شکایت کرنے لگے میں نے کہا کہ دوسروں کو کام میں لگانے کی اور ان کی شکایت کی آپ کو کیا ضرورت ہے آپ پہلے خود کام کرنا شروع کر دیں جتنا کبھی آپ سے ہو سکے۔ دوسروں کو آپ تنگ نہ کریں پھر کام میں خود کشش ہوتی ہے لوگوں کو خود بخود توجہ ہو جائے گی۔ جب وہ چلے گئے تو لوگوں نے مجھ سے کہا کہ تم نے ان کے مرض کو خوب سمجھا۔ واقعی بات یہی ہے کہ یہ خود تو کچھ کام نہیں کرتے اور دوسروں سے چندہ وصول کرنا اور کام لینا جانتے ہیں۔ خلاصہ یہ ہے سیکریٹری بننے کا شوق ہے اور کام کے نام صفر ہے۔ غرض واقعات سے معلوم ہوتا ہے کہ آجکل جو لوگ دین کی خدمت کرتے محض جاہ کے لئے کرتے ہیں دین اور رضاء حق مطلوب نہیں۔

(ایضاً صفحہ ۹)

(۹۰) حق تعالیٰ بدون ابتلا و امتحان کے

جنت کیوں عطا نہیں فرماتے

اس کا جواب یہ ہے کہ بیشک حق تعالیٰ اس پر قادر ہیں کہ بدون ابتلا و امتحان کے سب کچھ عطا فرمادیتے مگر وہ ایسا نہیں کرتے بلکہ انسان کو ابتلا و تکلیف کے بعد ہی دولت قرب عطا فرما دیتے ہیں اور قرب ہی کا نام نجات ہے اور ہلاکت فراق و بُد کا نام ہے۔

شہیدہ ام کہ سخن خوش کہ بر کنال گفت فراق باز نہ آں می کند کہ بتوان گفت
حدیث ہول قیامت کہ گفت واعظ شہر کنا بیست کہ از روزگار پھر گفت
چنان ایک مقام پر ارشاد ہے۔ أَحَبُّ النَّاسِ أَنْ يَبْرُكُوا أَنْ يَقُولُوا آمَنَّا وَهُمْ لَا يُفْتَنُونَ۔ راہ یہ کہ اس کی کیا وجہ ہے سوا اس کے بارہ میں ہمارے بزرگوں کا مسلک یہ ہے کہ حکم کی تفصیل میں گفتگو نہیں فرماتے۔ ان کا طریقہ یہ ہے۔ اٰمِنُوْا مَا اٰبِهَمُ مِنَ الدِّنِ۔ کہ جس چیز کو خدا تعالیٰ نے مبہم رکھا ہے تم بھی اس کو مبہم ہی رکھو۔

امتحان و ابتلا کی حکمت پس اجمالا ہمارا عقیدہ یہ ہے کہ ابتلا میں حکمت ضرور ہے گو ہم کو معلوم نہ ہو اور اس باب میں ایک بات جو بے ساختہ دل میں آتی ہے وہ یہ ہے

کہ اگر انسان سے طاعت بدون ابتلا مقصود ہو تو اس کے لئے ملائکہ پہلے سے موجود تھے انسان کے پیدا کرنے کی کیا ضرورت تھی کیونکہ ملائکہ طاعت بدون ابتلا ہی کرتے ہیں ان میں منازعت کا مادہ ہی موجود نہیں اور انسان کے اندر منقاومت و منازعت احکام کا مادہ رکھا گیا ہے مگر وہ ایک خاص درجہ پر ہے اور وہ بھی تکمیل اجر کے لئے اس میں رکھا گیا ہے کیونکہ طاعت بلا منازعت سے طاعت منازعت افضل ہے بوجہ مجاہدہ کے

نہ لوگ کیا خیال کرتے ہیں کہ وہ اس کہنے پر چھوڑ دیئے جائیں گے کہ ہر ایمان لے کے اور وہ امتحان میں مبتلا نہیں کئے جائیں گے؟
نہ مقابلہ سے لڑائی

وہ درجہ خاص کی قید میں نے اس لئے لگائی کہ اگر منازعت خاص درجہ پر نہ ہوتی تو الدین کیسے کے خلاف ہوتا۔ اس لئے میں نے یہ قید لگا دی اور یہ منازعت بھی ابتداء ہی میں ہوتی ہے بعد رسوخ کے یہ منازعت بھی باقی نہیں رہتی بلکہ احکام الہیہ امور طبعیہ بن جاتے ہیں حق تعالیٰ نے افعال حسیہ میں بھی یہی قاعدہ رکھا ہے چنانچہ ششی و غیرہ میں ابتداء ہی میں ارادہ کی ضرورت ہوتی ہے پھر ہر قدم پر ارادہ کی ضرورت نہیں رہتی بلکہ وہی پہلا ارادہ ستر قرار دیا جاتا ہے اور اسی وجہ سے اس کو فصل اختیاری کہا جاتا ہے اس پر یہ شبہ نہ ہو کہ شاید پھر ثواب کم ہو جاتا ہو گا کیونکہ طاعت بلا منازعت سے طاعت بمنازعت افضل ہے اس کا جواب یہ ہے کہ اللہ تعالیٰ کا معاملہ یہی ہے کہ ابتداء سے منازعت کا مقابلہ کرنے کے بعد ثواب منازعت ہی کا ہمیشہ ملتا ہے کیونکہ اس نے تو اپنی طرف سے مقاومت منازعت کے دوام کا مقصد کر کے عمل شروع کیا ہے چنانچہ ہر مسلمان جو روزہ نماز کا پابند ہے اس کا ارادہ یہی ہے کہ ہمیشہ نماز پڑھوں گا۔ ہمیشہ روزہ رکھوں گا۔ خواہ نفس کو کتنا ہی گراں ہو اب یہ حق تعالیٰ کی رحمت ہے کہ وہ بعد میں منازعت کو باقی نہیں رکھتے مگر چونکہ بندہ نے ہمیشہ کے لئے اس منازعت کا مقابلہ کرنے کا ارادہ کر لیا ہے اس واسطے اس کو زوال نماز کے بعد بھی بوجہ نیت دوام کے وہی ثواب ملتا ہے جو منازعت کے ساتھ ثواب ملتا ہے۔ تو جیسے ششی کو فصل اختیاری اسی لئے کہا جاتا ہے کہ ابتداء میں اختیار و ارادہ کی ضرورت ہے گو بعد میں ضرورت نہیں رہتی اسی طرح یہاں بھی گو بعد میں منازعت نہیں رہتی مگر چونکہ ابتدا میں منازعت کی مخالفت کی ضرورت تھی اس لئے انتہا تک اس مخالفت منازعت کو چٹکا ستر قرار دیا جائے گا۔ اور یہاں سے پتہ لگتا ہے حق تعالیٰ کی رحمت کا۔

عبادت میں لذت کے باوجود ثواب

ورنہ عقل کا مقتضایہ ہے کہ جب منازعت ختم ہو جاوے اور عبادت میں لذت و حظ پیدا ہو جائے تو اس شخص کو اجر نہ ملے کیونکہ اب طاعت مع الابتلاء نہیں ہے اس وقت

عقل کہتی ہے کہ یہ شخص اجر کا مستحق نہیں۔ مگر حق تعالیٰ فرماتے ہیں کہ تجھے ہمارے بندہ

سے محبت نہیں ہے ہم اس کو منازعت ہی کا اجرا دیں گے گو اب محنت کچھ نہیں رہی مگر اب ہم اس کو پیش دیں گے لیکن عقل پیش کو جائز نہیں کرتی۔ جیسے معتزلہ نے کہا ہے کہ گناہوں پر سزا دینا ضروری ہے عفو و مغفرت خلاف عقل ہے پس یوں کہئے کہ رسوخ کے بعد بندہ کی وہ حالت ہو جاتی ہے جو بعض پیروں کی وہ حالت سنی گئی ہے کہ جب کوئی مریدان کی دعوت کرتا ہے تو وہ دعوت کے بعد نڈرا بھی لیتے ہیں۔ جس کو دانت گھسائی کہنا چاہیے تو حق تعالیٰ نے یہ کر کے دکھلادیا کہ وہ بندہ کو دانت گھسائی بھی دیتے ہیں کیونکہ انتہا میں طاعت کا بجا لانا کچھ کمال نہیں رہتا بلکہ اس کے ترک میں تکلف ہوتا ہے۔ اخیر میں وہ حالت ہو جاتی ہے جو حدیث میں رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی شان میں وارد ہے کہ کان خلق القرآن کہ قرآن پر عمل کرنا آپ کی طبیعت تھی آپ کی تو فطرت ہی سے طبیعت تھی۔ مگر کاملین کی بھی اخیر میں اسی کے قریب حالت ہو جاتی ہے اور اس وقت اس کے حق میں وعیدات کی ایسی شان ہو جاتی ہے جیسے مان کچہ کو بعض دفعہ دو دھ پلانا چاہتی ہے اور وہ کھیل کے شوق میں بھاگتا ہے تو وہ اس کے چپٹ لگاتی ہے ایسے ہی شہتی کے لئے یہ وعیدات بغرض اظہار شفقت و رحمت ہیں بلکہ میں کہتا ہوں کہ مبتدی کے لئے بھی وعید محض اظہار شفقت و رحمت کے لئے ہے کیونکہ بات یہ ہے کہ انسان کو فطرۃ حق تعالیٰ سے محبت ہے اور مبتدی کو جو احکام میں منازعت ہوتی ہے یہ خلاف محبت نہیں بلکہ اس کا منشا یہ ہے کہ محبت کی وجہ سے اس کو حق تعالیٰ پر ناز ہے یہ یوں کہتا ہے کہ جب مجھے محبت ہے تو مجھے آرام دینا چاہیے میرے اذیتہ کا لیف اور قیود کیوں ہیں اور زبان حال یوں کہتا ہے ۷

ہم نے الفت کی نایں دیکھیں جانیں کیا چشم غضبناک کو ہم (سبیل السعید ص ۷)

(۹۱) اختلاف رویت قمر کی صورت میں لیلۃ القدر کے متعدد ہونے کا شبہ اور اس کا جواب

اس کا جواب یہ ہے کہ آپ کو خبر بھی ہے کہ وہاں رات دن نہیں ہیں اور یہ تو خود سائنس دان

بھی تسلیم کرتے ہیں کہ لیل و نہار کرۃ النسیم سے نیچے ہی نیچے ہیں۔ کرۃ النسیم کے اوپر رات دن نہیں بلکہ یکساں حالت ہے یہ جواب جب میرے دل میں آیا بڑی خوشی ہوئی اور اس سے ایک بات ابھی اور دل میں آئی ہے وہ یہ کہ معراج کے ذکر میں اللہ تعالیٰ نے مسجد حرام سے مسجد اقصیٰ تک کی سیر بیان فرمائی ہے۔ سیر سموات کا ذکر نہیں فرمایا۔ جس سے بعض اہل باطن نے سموات کی نفی پر استدلال کیا ہے تو وہاں سیر سموات کا ذکر اس واسطے نہیں کیا کہ وہاں لیلہ کی قید بھی مذکور ہے پس ضروری ہوا کہ اسی قدر سیر بیان کی جائے جو لیل کے اندر واقع ہوئی اور ظاہر کرے کہ سیر سموات لیل و نہار سے باہر ہوئی ہے سموات میں لیل و نہار کا تحقق ہی نہیں تو اس سے سیر سموات کی نفی پر استدلال محض لغو ہے ہاں یہ کہہ سکتے ہیں کہ سیر سموات رات میں نہیں ہوئی۔ سو یہ سلم ہے بلکہ ہم تو یوں کہتے ہیں کہ وہ تو نہ دن میں ہوئی نہ رات میں وہ تو ایسے مقام پر ہوئی ہے جہاں رات ہے نہ دن۔ بہر حال وہاں لیل و نہار نہیں ہے اس واسطے لیلۃ القدر کی جوشان و برکات ہیں وہ لیل و نہار کے ساتھ مقید نہیں۔ بلکہ ارادہ حق کے تابع ہیں۔ تو اس کی مثال بارش کی طرح ہے کہ یہاں کے کرۃ النسیم کے نیچے آج بارش ہے اور کلکتہ کے کرۃ النسیم کے نیچے کل بارش ہے اگر شب قدر بھی ایسی ہی ہو کہ آج یہاں ہے اور کلکتہ میں کل ہے تو اس میں اشکال کی کیا بات ہے۔ آخر بارش میں کیا ایسا اختلاف نہیں ہوتا۔ پھر معنوی بارش کے برکات میں ایسا اختلاف ہو تو کیا تعجب ہے اس لئے بے فکر ہو کر آپ اپنی ہی تائیدوں کے حساب سے کام کیجئے۔ اللہ تعالیٰ تو سب کی نیتوں اور کام کو دیکھتے ہیں۔ وہ سب کو ان کے حساب کے موافق لیلۃ القدر کی برکات عطا فرمادیں گے۔ (الکمال العدۃ ص ۲)

(۹۲) محض کتابیں دیکھ کر ہی اپنی اصلاح نہیں ہو سکتی

میں کتابوں کو بیکار نہیں کہتا۔ وہ بیشک کام کی ہیں مگر طبیب کے کام کی ہیں مریض کے کام کی نہیں۔ کتب طب سے کوئی مریض اپنا معالجہ نہیں کر سکتا حالانکہ کتابوں میں سب کچھ موجود ہے اور طبیب ان ہی سے علاج کرتا ہے مگر تم نہیں کر سکتے اگر معمولی مرض کا علاج کر بھی لیا تو شدید امراض کا علاج تو کبھی نہیں کر سکتے چنانچہ بحران کی بحث گو طب کی کتابوں

میں مذکور ہے مگر اس کو ہر شخص نہیں سمجھ سکتا یہ بحث اس قدر لطیف اور دقیق ہے کہ اطباء حال نے یعنی ڈاکٹروں نے تو گھبرا کر اس کا انکار ہی کر دیا کہ بحران کوئی چیز نہیں۔ مگر اطباء قدامت نے اس بحث کو بڑی خوبی سے ضبط کیا ہے اور ایسا معلوم ہوتا ہے کہ ان کو اس بحث کا الہام ہوا ہے چنانچہ انہوں نے بحار کے ایام کی تقسیم کی ہے کہ بعض ایام میں طبیعت و مرض میں مقابلہ ہوتا ہے طبیعت ان ایام میں مرض کو دفع کرنا چاہتی ہے اور مرض طبیعت کو دبا چاہتا ہے۔ اس کیفیت و مقادمت کا نام بحران ہے پھر ان ایام میں بعض دن تو سخت بحران کے ہیں اور بعض دن ہلکے بحران کے ہیں۔ اس لئے مریض کو اور اس کے تیمار داروں کو چاہیے کہ جب کسی کو بحار آوے اس کا دن اور وقت یاد رکھیں تاکہ طبیب سے بیان کر سکیں اور طبیب کو ایام بحران کی رعایت آسان ہو۔ کھلا محض کتاب دیکھ کر ان امور کی رعایت مریض سے کیونکر ہو سکتی ہے ہرگز نہیں ہو سکتی۔

حضرت کا اپنا واقعہ

بلکہ میں تو تجربہ سے کہتا ہوں کہ مریض اپنے معالجہ میں معمولی امراض کے اندر بھی غلطی کھائے گا۔ چنانچہ مجھے پہلے سال برسات کے اخیر میں میں بخار آیا کرتا تھا۔ اب تو الحمد للہ

بہت سالوں سے نہیں آیا۔ اور ہمیشہ صغریٰ بخار ہوتا تھا۔ میں نے ایک دفعہ خیال کیا کہ مجھے غلبہ صغریٰ سے بخار ہوتا ہے اور حکیم صاحب ہر سال قریب ایک ہی نسخہ لکھتے ہیں لاؤ اس کو نقل کر لیں۔ جب بخار آیا کرے گا اس کو استعمال کر لیا کرے گا حکیم صاحب تو تکلیف دینے کی ضرورت نہ ہوگی چنانچہ ایک سال ایسا ہی کیا کہ پچھلے سال کا لکھا ہوا نسخہ خود ہی استعمال کر لیا مگر چند روز استعمال کرنے سے بھی خاک نفع ہوا۔ آخر کار حکیم صاحب کو بلایا انہوں نے نسخہ لکھا اس کے پینے سے آرام ہو گیا پھر تحقیق ہوئی کہ اس سال صغریٰ کے ساتھ بلغم صاحب بھی تشریف لے آئے ہیں کیوں کہ اب بڑھاپے کا سن شروع ہو گیا۔

اب اگر میں اس نسخہ کی بھی نقل کر لیتا کہ چلو اس میں صغریٰ اور بلغم دونوں کی رعایت ہے تو یقیناً اس سے بھی اگلے سال نفع نہ ہوتا بلغم ہی بڑھتا۔ (یعنی بلکہ تکلیف و غم ہی زیادہ ہوتا۔ یہ "بل غم" مرکب ہے مفرد نہیں) کیونکہ اس کا مجھے اندازہ کیسے ہو سکتا ہے کہ اس سال بلغم صغریٰ سے زیادہ ہے یا مسادی ہے یا کم ہے اس کا اندازہ تو طبیب

ہی کر سکتا ہے جو بنفس کی حالت کو پہچانتا ہے اس لئے کتب طب سے معالجہ کرنا طیب ہی کا کام ہے اسی طرح احیاء العلوم و فنون تک یہ جو تصوف کی کتابیں ہیں بیکار نہیں بلکہ کارآمد ہیں مگر شیخ کے کام کی یہیں طالب کے کام کی نہیں طالب کو تو اپنے معالجہ کے لئے کسی محقق کا اتباع لازم ہے۔ (الرغبۃ المغربۃ ص ۲۱)

(۹۳) نفع متعدی کا علی الاطلاق نفع لازمی

سے افضل ہونا درست نہیں

اصل یہی ہے کہ نفع لازمی نفع متعدی سے افضل ہے کیونکہ آیت میں رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کو امر ہے کہ جب آپ نفع متعدی سے فارغ ہو جائیں یعنی تبلیغ سے تو نفع لازمی میں مشغول ہوں یعنی توجہ الی اللہ میں یہ سیاق صاف بتلا رہا ہے کہ نفع لازمی متعدی سے افضل ہے کیونکہ متعدی سے فارغ کو طلب کیا گیا ہے نہ کہ لازمی سے پھر اس کے بعد نفع لازمی میں اشتغال کلی کا حکم ہے کہ اس میں توجہ رکھئے۔ اس وقت دوسری طرف التفات نہ ہو جیسا الیٰ ربک کی تقدیم کا مقصد مضیٰ ہے اور ظاہر ہے کہ اگر نفع متعدی افضل ہوتا تو اس سے فراع مطلوب نہ ہوتا بلکہ یوں ارشاد ہوتا۔ فاذا حسرت من ذکر ربک فا نصب فی التبلیغ والیہ فارغب نیز نفع لازمی میں مشغول ہونے کے وقت نفع متعدی سے قطع نظر کا امر ہوتا جیسا تقدیم معمول کا مدلول ہے کیونکہ مقصود بالذات سے کسی وقت قطع نظر نہیں ہوا کرتی۔ اس سے صاف معلوم ہو رہا ہے کہ نفع متعدی مقصود بالعرض اور نفع لازمی مقصود بالذات ہے۔ اور گویا مشہور کے حلال ہے مگر حقیقت یہی ہے اور قول مشہور کا منشا یہاں قویہ ہوا ہے کہ بعض جگہ نفع متعدی نفع لازمی سے اولیٰ و اقدام ہو گیا۔ مگر اس سے فضیلت بالذات لازم نہیں آتی۔ بلکہ اذمیت

لے دوسرے کو نفع پہنچانا۔ لے خود اپنے لئے نفع حاصل کرنا۔ سہ۔ زیادہ تاکید والا۔

لے سب سے مقدم (پہلے)

واو کہ بیت ایک عارض کی وجہ سے ہوئی ہے کہ وہ نفع متعدی پھر نفع لازمی کی طرف مضیٰ ہوگا کہ دوسرا شخص بھی رغبت الی اللہ کرے گا۔ اور ذکر و صلوٰۃ میں مشغول ہوگا اور اگر اس پر کوئی یثرب کرے کہ شاید نفع متعدی اس لئے مشروع ہوا ہے کہ وہ نفع لازمی کے بعد پھر متعدی کی طرف مضیٰ ہو۔ اس طرح کہ دوسرا شخص بھی اپنی اصلاح کر کے تبلیغ کے قابل ہو گا۔

تو اس کا جواب یہ ہے کہ اولاً تو تبلیغ کے قابل بھی وہ نفع لازمی حاصل کرنے کے بعد ہوگا کیونکہ جسکی

خود اصلاح نہ ہوئی ہو وہ دوسروں کی اصلاح نہیں کر سکتا۔ پھر دوسرے کا تبلیغ کے قابل ہونا یقینی نہیں کیونکہ بعض لوگ اصلاح و تکمیل و غیرہ کے اہل نہیں ہوتے اور نفع لازمی کا اہل ہر شخص ہے۔ پس نفع متعدی پر نفع لازمی کا ترتیب یقینی ہے کہ آج ہی سے اس کا ترتیب شروع ہو جاتا ہے نفع متعدی کا ترتیب مہوم ہے کہ نہ معلوم یہ دوسروں کی اصلاح کے قابل ہوگا یا نہیں اور تجربہ یہ ہے کہ دوسروں کی اصلاح کے قابل سو میں سے ایک دو ہوتے ہیں۔

پھر قابل ہو ابھی۔ تو نہ معلوم کب ہوگا اور ہوگا بھی تو نہ معلوم اس کو اصلاح غیر کی نوبت آئے گی یا نہیں کیونکہ بہت سے سالک نفع متعدی کے قابل ہوتے ہیں مگر ان کو اس کی نوبت ہی نہیں آتی یا کم آتی ہے تو ایسے نفع مہوم کے لئے کسی شی کا ایسا مشروع ہونا کہ وہ مقصود بالذات ہو جائے۔ از بس بعید ہے ہاں یہ ممکن ہے کہ بالعرض یہ بھی مقصود ہو جائے لیکن مقصود بالذات وہی نفع ہو سکتا ہے جس کا ترتیب یقینی ہو اور اس کا ظہور بھی مہوم نہ ہو اور وہ نفع لازمی ہے جو نفع متعدی پر فوراً ہی مرتب ہونا شروع ہو جاتا ہے دوسرے اگر نفع سے مقصود نفع متعدی ہوگا تو طالب کو اس مقصودیت کی اطلاع کے بعد اس کے قصد کی اجازت بھی ہوگی۔ کیونکہ مقصود کا ارادہ بھی مقصود ہوتا ہے اور مقصود کی نیت مرض تو ہو ہی نہیں سکتی۔ مگر شیوخ محققین سے جو کہ مجتہدین فن ہیں جن کا فتویٰ قواعد فن سے حجت ہے ان سے پوچھئے کہ وہ طالب کو نفع متعدی کی نیت کی اجازت بھی دیتے ہیں یا نہیں۔ وہ فرماتے ہیں کہ اگر طالب ذکر و شغل سے مخلوق کو نفع پہنچانے کا قصد کرے گا تو اس کو کبھی فتیائے ہوگا یہ ارادہ راہ زن طریق ہے اپنی اصلاح کے زمانہ میں اس کو صرف اپنی اصلاح کا قصد کرنا چاہیے دوسروں کی اصلاح کا خیال

مانع طریق بلکہ قاطع طریق ہے اس سے اپنی اصلاح کے لئے بڑجاتے ہیں تو یہ اچھا مقصود بالذات ہوا۔ جس کا قصد کرنا راہِ زن طریق ہے۔ اب بتلائیے اس حالت میں نفع متعدی کو افضل اور مقصود بالذات کیسے کہہ سکتے ہیں۔ پھر اپنی اصلاح کو تکمیل کے بعد بھی ہر شخص کو نفع متعدی کی اجازت نہیں۔ بلکہ اس کا اہل صرف وہی ہے جس کو مشائخ نے اجازت دی ہو اگر نفع متعدی اصل ہے اور یہی مقصود بالذات ہے تو تکمیل کے بعد اس کو از خود نفع متعدی میں مشغول ہونے سے کیوں روکا جاتا ہے اور اجازت شیخ کی قید کیوں لگائی جاتی ہے یہ بھی اس کی دلیل ہے کہ، نفع متعدی مقصود بالذات نہیں ورنہ لازم آتا ہے کہ جن لوگوں کو نفع متعدی کی اجازت نہ دی گئی ہو وہ سب کے سب ناقص ہی ہوں حالانکہ مشائخ کے نزدیک یہ بالکل غلط ہے۔ وہ تقریر کرتے ہیں کہ کمال مقصود کا حصول اس امر پر موقوف نہیں۔

اجازت کی قید کی وجہ اور قید اجازت کا یہ راز ہے کہ امر بالمعروف کے لئے کچھ آداب ہیں جن کے قابل ہر ایک نہیں ہوتا۔ مثلاً بعضوں کو سیاست و تدبیر کا مملکہ نہیں ہوتا جس کے بغیر امر بالمعروف بجائے مفید ہونے کے موجب فتنہ و فساد ہو جاتا ہے۔ اس لئے بعض لوگوں کو گودہ درجہ کمال کو پہنچ چکے ہوں ارشاد و تلقین و نفع متعدی کی اجازت نہیں دی جاتی مگر اس سے ان کے کمال کی نفی نہیں ہوتی۔ حالانکہ نفع متعدی کا مقصود بالذات ہونا اس صورت میں نفی کمال کو مستلزم ہے جو اجماع محققین کے خلاف ہے دوسرے میں پوچھتا ہوں کہ اگر نفع متعدی مقصود بالذات ہے تو حربی دار الحرب میں اسلام لائے اور نفع متعدی پر قادر نہ ہو تو بتلائیے وہ کیا کرے نفع لازمی کو لازم بکڑے یا نفع متعدی کو۔ اگر نفع متعدی میں مشغول ہونا لازم کیا گیا تو تکلیف مالایطاق، اور اگر نفع لازمی کا اس کو امر کیا گیا تو ثابت ہوا کہ نفع متعدی مقصود بالذات نہیں کیونکہ مقصود بالذات سے کوئی مسلمان محروم نہیں ہو سکتا یہ سب اس امر کے دلائل ہیں کہ نفع متعدی مقصود بالذات نہیں بلکہ مقصود بالعرض ہے۔ اور مقصود بالذات مقصود بالعرض سے افضل ہوا کرتا ہے۔

(الرغبة المرغوبہ ص ۶۷)

(۹۴) جبریل کا فرعون کے ڈوبنے کے وقت اس کے منہ میں میٹھی ٹھونسنا

اس کا علمائے نے یہ جواب دیا ہے کہ حضرت جبریل علیہ السلام کو معلوم تھا کہ عذابِ یکتا کے بعد توبہ قبول نہیں ہوتی۔ حق تعالیٰ فرماتے ہیں۔ **لَكُمْ يَوْمَ ذَلِكَ يَنْفَعُهُمْ اِيْمَانُ سَلَمٌ** لَيْتَا رَاَوْ بَاْسًا۔ تو وہ اسلام سے نہ روکتے تھے صورت اسلام سے روکتے تھے جس پر گو رحمت فی الآخرت مرتب نہیں ہوتی مگر رحمت فی الدنیا متوجہ ہو سکتی ہے جیسے منافقین صورت اسلام کے سبب قتل اور قید ہونے سے محفوظ رہے۔ اسی طرح احتمال تھا کہ وہ بھی غرق و ہلاک سے بچ جاتا۔ پھر اس پر اگر کوئی یہ سوال کرے کہ اس وقت آیت میں بآسنا سے مراد عذاب دینا تو ہے نہیں کیونکہ عذاب دینا کی رویت قبل انکشاف آخرت قبول ایمان سے مانع نہیں۔ اور ظاہر ایہاں عذاب آخرت کا انکشاف نہ ہوا تھا ورنہ دنیا کی طرف کا احساس بالکل باطل ہو جاتا۔ تو اس کا جواب یہ ہے کہ یہ سلم نہیں بلکہ انکشاف آخرت کے بعد بھی ادھر کا احساس باقی رہنا ممکن ہے۔ چنانچہ بعض مختصرین کے واقعات سے معلوم ہوتا ہے کہ انہوں نے فرشتوں کو بھی دیکھا۔ اور اس کے ساتھ اپنے گھر کی عورتوں کو بھی بچانا۔ چنانچہ گھر والوں سے کہا کہ فرشتے بیٹھے ہیں تم ان سے پردہ کرو۔ تو ابتداء انکشاف کے ساتھ ادھر کا ہوش رہ سکتا ہے۔

اور فرعون کے واقعہ سے ظاہر بھی معلوم ہوتا ہے کہ اس نے جس وقت ایمان ظاہر کیا ہے اس وقت اس کو انکشاف آخرت کے ساتھ دنیا کے بھی ہوش تھے چنانچہ اس کا قول **اٰمَنْتُ بِاللّٰهِ اٰمَنْتُ بِہٖ** بَنُوْا مِمْلُکَیْکَ بَلَّار ہا ہے کہ اس وقت اسرائیل کا

لے جب وہ ہمارا عذاب دیکھیں گے تو ان کا ایمان لانان کے لئے نافع نہ ہوگا۔ یہ میں اس ذات پر ایمان لایا جس پر بنو اسرائیل ایمان لائے۔

حق پر ہونا اور ان کاموں ہونا اس کے خیال میں تھا اور یہ دنیا کا واقعہ ہے تو اس کو ادھر کے ہوش ضرور تھے لیکن اور معلوم ہو چکا کہ یہ انکشان عذاب آخرت کے ساتھ جمع ہو سکتا ہے بس اس دلیل سے عذاب آخرت کی نفی نہیں ہو سکتی اور یہ انکشان مانع ہے قبول ایمان سے۔ پس اشکال رفع ہو گیا۔ اب ایک سوال رہ گیا کہ جب یہ حالت مانع ہے قبول ایمان اور ایمان نام ہے تصدیق کا اور وہ بعد انکشان آخرت کے مقبول نہ ہتی اگرچہ زبان سے تلفظ کیا جاوے تو پھر تلفظ سے روکنے سے کیا فائدہ ہوا۔ اور اگر زبان سے اقرار کرنا کسی درجہ میں مفید بھی مان لیا جاوے تو اقرار کا قصد بھی کافی ہونا چاہیے اگرچہ کسی عذر سے عجز ہو گیا ہو۔ اور یہاں عجز ہو گیا کچھ کی وجہ سے تو وہ اقرار مفید نہ ہو گیا۔ پھر کچھ ٹھونسے سے کیا فائدہ ہوا۔

فرعون کی لغش کا محفوظ رہنا
سو اس کا جواب وہی ہے جو اوپر گذر کر جبریل علیہ السلام نے ظاہری رحمت کو بھی اس کے لئے گوارا نہیں کیا اگرچہ رحمت ظاہری کا ایک گونہ ظہور لغش کو محفوظ رکھنے سے ہو گیا جیسا کہ ارشاد ہے۔ فَلْيَوْمَ مُنْجِيَةً مِّنْكَ (الایات) مگر اس پر بھی ایک سوال ہے کہ اس ظاہری رحمت میں ان کا کیا حرج تھا۔ اس کا جواب وہی ہے جس کو میں ذکر کر رہا ہوں کہ اس فعل کا منشا غلبہ بغض فی اللہ تھا۔ اس میں یہ بھی گوارا نہ ہوا۔ اور بغض حق ہے ایسا بغض بدو ن غلبہ عشق حق کے ہو نہیں سکتا۔
(العیذ والوعید رضا)

(۹۵) خدا تعالیٰ کی پیشین گوئی کسی مر کے متعلق
اس کو لازم نہیں کہ وہ غیر اختیاری ہو جائے

میرے پاس اس کی دلیل موجود ہے جو چند مقدمات پر مبنی ہے۔ ایک مقدمہ

۱۔ پس میں نے تجھے آج تیرے بدن کے ساتھ بجات دی۔

تو یہ ہے کہ حق تعالیٰ شانہ فعل عبث سے پاک ہیں اور دوسرا مقدمہ یہ ہے کہ محقق طبیب بعد مایوسی کے دوا نہیں دیا کرتا اور اگر دیتا ہے بھی تو مرہض کو مجبور نہیں کرتا بلکہ بعض توصات کہہ دیتے ہیں کہ مرہض بچے گا نہیں اس کو دوامت دوا اور اگر کوئی محقق اس حالت میں بھی جبرا دوا دیتا ہے تو اس کی وجہ یہ ہے کہ اس کو علم غیب نہیں۔ وہ اپنے قواعد طبیب سے اس مرض کو لاعلاج سمجھتا ہے۔ مگر سمجھنا غلطی ہے قطعاً نہیں وہ قدرت خدا پر نظر کر کے امیدوار ہے عقل در اسباب میدار دنظر عشق می گوید مسبب را نگر

مگر حق تعالیٰ تو علم غیب ہے اگر ختم اللہ علی قلوبہم سے ان لوگوں کے لاعلاج ہونے اور علاج کے غیر اختیاری ہونے پر دلالت ہوتی۔ تو یہ دلالت قطعی ہوتی کیونکہ عالم الغیب کا کلام ہے اور نفی اختیار کے ہوتے ہوئے یہ محال ہے کہ دوا پر جبر کیا جاوے کیونکہ لَا يُكَلِّفُ اللَّهُ نَفْسًا إِلَّا دُسْعًا کے خلاف ہے۔ تیسرا مقدمہ یہ ہے کہ حق تعالیٰ نے ان لوگوں کو دوا پر مجبور کیا ہے یا اَيْتُهَا النَّاسُ اَعْبُدُوا رَبَّكُمْ میں خطاب عام ہے اور یہ آیت مکی ہے پھر لفظ یا اَيْتُهَا النَّاسُ خود عموم کو بتلا رہا ہے جس میں تمام کفار کو توحید و ایمان اختیار کرنے کے متعلق خطاب ہے جن میں وہ لوگ بھی تھے جن کے بارہ میں ختم اللہ علی قلوبہم فرمایا گیا ہے پھر اس پر اجماع ہے کہ ابوجہل ابولہب و عیزہ ایمان کے مکلف نہ ہوں اور اس حکم سے مستثنیٰ ہوں تو پھر ان کو عذاب نہیں ہو سکتا۔ کیونکہ وہ یہ کہہ سکیں گے کہ حضور ہم کو جو ترک ایمان اور کفر کی وجہ سے جو ہم کو عذاب ہو رہا ہے تو اخیر زمانہ میں ہم تو حکم ایمان سے مستثنیٰ ہو گئے تھے آپ نے ختم اللہ علی قلوبہم نازل فرمادیا تھا حالانکہ ان کا معذب ہونا منصوص ہے کیونکہ ختم اللہ علی قلوبہم کے ساتھ ہی ولہم عذاب عظیم بھی وارد ہے پس یہ ماننا پڑے گا کہ جن کے بارہ میں ختم اللہ علی قلوبہم فرمایا گیا ہے ایمان کے مکلف وہ بھی تھے اس لئے مستثنیٰ نہ تھے۔ اب میرا دعویٰ ثابت ہو گیا کہ جن لوگوں کے متعلق ختم اللہ علی قلوبہم نازل ہوا ہے ان کا مرض روحانی لاعلاج نہ تھا۔ اگر روحانی مطلب میں کوئی مایوس العلاج ہوتا تو یہ لوگ ہوتے مگر وہ بھی مایوس العلاج نہیں تو ثابت ہو گیا کہ مرض روحانی کسی کا بھی لاعلاج نہیں۔ رہا یہ سوال کہ پھر پیشین گوئی کی کیا ضرورت تھی۔ جواب یہ ہے کہ ایک راز تھا جو حق تعالیٰ نے حضور صلی اللہ علیہ وسلم کو بتلادیا۔ مگر اس کا بھی مطلب یہ ہے۔ لایومن ابوجہل و نحوہ مع بقاء اختیار ۵۔ کہ یہ لوگ ایمان نہ لائیں گے مگر یہ ایمان نہ لانا

ان کے اختیار سے ہوگا یہ مطلب نہیں کہ ان کو ایمان بر قدرت و اختیار ہی باقی نہیں رہا۔ خوب سمجھ لو اس سے زیادہ کلام کرنا۔ فعل فی القدر ہے جس کی اجازت نہیں۔ غرض یہ بات ثابت ہوگئی کہ نصوص میں کسی امر کی پیشین گوئی وارد ہونے سے اس کا خارج از اختیار ہونا لازم نہیں آتا۔ اور جب وہ اختیار ۔۔۔ سے خارج نہیں تو اس کی تدبیر کرنا فضول نہیں ورنہ اگر پیشین گوئی مانع تدبیر ہو تو چلیے کہ آج سے قرآن کے حفظ کو ترک کر دیا جائے کیونکہ قرآن میں پیشین گوئی ہے۔ انا نحن نزلنا الذکر وانا لعلیٰ انظرون جس میں حفاظت قرآن کا وعدہ ہے تو پھر نوح بالشر قرآن کا پڑھنا بھی چھوڑ دو لکھنا بھی چھوڑ دو چھاپنا بھی چھوڑ دو۔ اور جو لکھے ہوئے رکھے ہیں ان کو دفن کر دو اور کہہ دو کہ بس قرآن کا حافظ اشرہی کا فی ہے ایک ہی حافظ بہت ہے اور وہ حافظ بھی کیسا جو محافظ بھی ہے جسے طریقے حفاظت کے ہیں وہ سب خود ہی کر لیں گے کیونکہ انا لعلیٰ انظرون میں سب طریقے آگئے۔ مگر مسلمانوں نے آج تک ایسا نہیں کیا حالانکہ یہاں بھی تو پیشین گوئی ہو چکی ہے پھر اس کی وجہ یہاں تو آپ نے یہ تجویز کیا کہ قرآن کو حفظ بھی کیا اور لکھا بھی اور چھاپا بھی اور ان سب باتوں کو اپنے اوپر فرض بھی سمجھا۔ اور نا اتفاقی کے متعلق پیشین گوئی ہو چکی ہے تو اب علاج کی کیا ضرورت ہے۔ میں کہتا ہوں کہ جب حفاظت قرآن کا وعدہ ہو چکا ہے تو پھر آپ کی حفاظت کی کیا ضرورت ہے۔ آپ پر بھی وہی اعتراض پڑتا ہے جو آپ اس مسئلہ میں ہمارے اوپر کر رہے ہیں۔ اس کا جواب دیجئے۔ آخر دونوں باتوں میں ماہ الفرق کیا ہے۔ فرق کا مبنی بتلائے۔ اگر آپ نہیں بتلاتے تو لیجئے میں بتلاتا ہوں آپ اس اعتراض کے جواب میں یہ کہہ سکتے ہیں کہ "انا لعلیٰ انظرون" کے معنی یہ ہیں کہ ہم ہر زمانے میں ایسے لوگ پیدا کرتے رہیں گے جو اس کی حفاظت میں سعی کرتے رہیں گے اور ہم حفاظت کے طریقے ان کے قلوب میں ڈال دیں گے کہ وہ اس کو یاد بھی کریں گے لکھیں گے بھی پڑھیں گے بھی جیسا کہ حفاظت قرآن کی پیشین گوئی کے بعد اپنی آپ کی حفاظت کو بھی اس میں دخل ہے۔ اسی طرح نا اتفاقی کی پیشین گوئی کے بعد بھی آپ کی تدبیر ہی کو اس میں دخل ہے اور پیشین گوئی کے بھی یہ معنی ہیں کہ چونکہ یہ لوگ باختیار خود بد پرہیزی کریں گے اس لئے نا اتفاقی رہے گی۔ پس یہ بات ثابت ہوگئی کہ خدا اور رسول کا کسی چیز کے متعلق پیشین گوئی کرنا اس کو مستلزم نہیں کہ وہ دائرہ تکلیف سے باہر ہو جاوے اور اس کی تدبیر نہ کی جاوے اور اس کا راز وہی ہے۔ جو

میں نے شروع میں کہا تھا کہ پیشین گوئی کبھی مرض کے لاعلاج ہونے سے کی جاتی ہے اور کبھی مرین کے بد پرہیز ہونے کی وجہ سے اور امراض روحانیہ میں لاعلاج کوئی مرض نہیں یہاں جو پیشین گوئی ہوتی ہے مرین کے بد پرہیز ہونے کی وجہ سے ہوتی ہے۔ (الانداد ص ۵)

(۹۶) خلافت فاروقیہ کو خلافت صدیقیہ سے کثرت فتوحات کی وجہ سے افضل سمجھنا غلط ہے

حضرت ابو بکر صدیق رضی اللہ عنہ کے زمانہ خلافت میں جدید فتوحات کچھ زیادہ نہ ہوئی تھیں بلکہ ان کی خلافت کا زیادہ زمانہ خود مسلمانوں کو سنبھالنے میں صرف ہوا۔ حضور صلی اللہ علیہ وسلم کے وصال کے بعد بعض قبائل مرتد ہو گئے تھے کچھ لوگوں نے زکوٰۃ کی فرضیت کا انکار کر دیا تھا۔ تو حضرت صدیق اکبر رضی اللہ عنہ کا زمانہ خلافت اس فتنہ از تدارک کے فرو کرنے اور مسلمانوں کی حالت سنبھالنے میں صرف ہوا۔ مخالفین کے ملک فتح کرنے کی زیادہ نوبت نہ آئی اور حضرت عمر بن الخطاب رضی اللہ عنہ کے زمانہ خلافت میں شاید کوئی دن بھی جدید فتوحات سے خالی نہیں رہا۔ روزانہ یہی خبریں آتی تھیں کہ آج فلاں شہر فتح ہو گیا۔ اور کل فلاں شہر پر حملہ ہے، یہاں تک کہ دس سال کے عرصہ میں حکومت اسلامیہ شرقاً و غرباً پھیل گئی اس لئے بعض کم فہم خلافت عمریہ کو خلافت صدیقیہ سے افضل شمار کرتے ہیں مگر عقلمند خوب جانتے ہیں کہ مکان کی خوبصورتی میں زیادہ کمال اس شخص کا ہے جس نے کہ اول نقشہ تیار کیا تھا اور بنیادیں قائم کی تھیں کیونکہ اس کو بہت دماغ سوزی سے کام کرنا پڑا ہے۔ مکان کا خوبصورت نقشہ بنانا اور بنیاد کا مستحکم کرنا یہ بڑا کام ہے دیواریں قائم کرنا وہاں کا اتنا بڑا کمال نہیں کیونکہ وہ تو اینٹ پرائیڈ رکھنا چلا گیا اس کو کونسی دماغ سوزی کرنی پڑی ظاہر میں لوگ دوسرے معمار کی تعریف کرتے ہیں کیونکہ مکان کو اس نے مکمل کیا۔ مگر حقیقت شناس سمجھتا ہے کہ اس مکان کی خوبصورتی بڑا کمال نہیں بڑا کمال نقشہ بنانا ہے

اور بنیاد قائم کر نیوالے کا ہے۔ اسی طرح جو اسرار شناس ہیں وہ جانتے ہیں کہ خلافتِ صدیقیہ سے خلافتِ عمریہ کو کوئی کبھی نسبت نہیں۔ کیونکہ حضرت صدیق اکبر کو حکومت اسلامیہ اور خلافت کی بنیاد قائم کرنے میں جو تعب برداشت کرنا پڑا ہے اس کا عشرِ عشر بھی حضرت عمرؓ کو نہیں پیش آیا۔ یہ کام اسی عالی حوصلہ خلیفہ کا تھا کہ ایسے فتنے کے زمانہ میں جب کہ خود اپنی ہی جماعت قبضہ سے باہر ہونا چاہتی تھی تمام فتنوں کا مقابلہ کر کے اور ان کو ایک دم نیست و نابود کر کے ڈھائی سال کے عرصہ میں خلافتِ اسلامیہ کے کھونٹے گاڑ دیئے اور نظامِ حکومت کو ایسے محکم اصول پر قائم کر دیا کہ بعد کے خلیفہ کو کوئی پریشانی ہی نہ پیش آسکے۔ حضرت عمر رضی اللہ عنہ خلافت میں وہ اصول جاری ہو گئے اور نظامِ صدیقی شائع ہو گیا۔ تو بڑا کمال حضرت صدیقؓ کا ہے۔ اور جس قدر فتوحات حضرت عمر رضی اللہ عنہ کے زمانہ میں ہوئی ہیں ان سب کا ثواب حضرت صدیقؓ کے صحیفہ اعمال میں اخل ہو گا اہل تمدن و سیاست اس کو خوب سمجھتے ہیں کہ قانون جاری کرنے سے زیادہ مشکل قانون بنانا ہے۔ قانون بنانے والے کو جس مشقت کا سامنا ہوتا ہے جاری کرنے والے کو اس کا دسواں حصہ بھی پیش نہیں آتا۔ (الجلال والابتنار ص ۹)

(۹۷) کیا چار سو برس کے بعد اجتہاد کا دروازہ بند ہو گیا؟

اس کے یہ معنی نہیں ہیں کہ چار سو برس کے بعد کسی کو اجتہاد کے قابل دماغ نہیں ملا کیونکہ اس پر کوئی دلیل قائم نہیں، علاوہ ازیں یہ مطلقاً صحیح بھی نہیں ہو سکتا۔ کیونکہ ہر زمانہ میں ہزاروں ایسی جزئیات نئی نئی پیش آتی ہیں جن کا کوئی حکم ائمہ مجتہدین سے منقول نہیں اور علماء خود اجتہاد کر کے ان کا جواب بتلاتے ہیں پس اگر اجتہاد کا باب بالکل بند ہو گیا ہے اور اب کسی کا دماغ اجتہاد کے قابل نہیں ہو سکتا تو کیا ایسے نئے نئے مسائل کا جواب شریعت سے نہیں ملے گا۔ یا ان مسائل کے جواب کے لئے کوئی نیا نبی آسمان سے اترے گا۔ اگر یہی بات ہے تو خدا خیر کرے کہیں قیامت، دن والے نہ سن لیں۔ کہیں یہ بات ان کے کافوں میں پڑ گئی تو مسیح موعود کے دلائل نبوت کی فہرست میں ایک اور دلیل کا اضافہ کر لیں گے پھر اس آیت کے کیا معنی ہوں گے اَلْیَوْمَ اَکْمَلْتُ لَكُمْ دِیْنَكُمْ جس سے معلوم ہوتا ہے کہ دین کی تکمیل ہو چکی۔ کہ دروازہ اجتہاد اگر بالکل بند کر دیا جائے تو پھر شریعت کی تکمیل کس طرح مانی جائے گی

کیونکہ ظاہر ہے کہ بہت سے مسائل ایسے ہیں کہ ان کا جواب کتب فقہ میں مذکور نہیں نہ ائمہ مجتہدین سے کہیں منقول۔

پچھلے دنوں میں ایک سوال آیا تھا کہ ہوائی جہاز نے مسائل کے جوابات میں نماز ہو سکتی ہے یا نہیں اب بتلائیے کہ اگر اجتہاد بعد چار سو برس کے بالکل جائز نہیں تو اس مسئلہ کا شریعت میں کوئی کبھی جواب نہیں پہلے زمانہ میں نہ ہوائی جہاز تھا نہ فقہاء اس کو جانتے تھے۔ نہ کوئی محکم لکھا۔ اب ہم لوگ خود اجتہاد کرتے ہیں۔ اور ایسے نئے مسائل کا جواب دیتے ہیں تو فقہاء رحمہم اللہ کے اس قول کا یہ مطلب نہیں کہ چار سو برس کے بعد اجتہاد بالکل بند ہو گیا۔ بلکہ مطلب یہ ہے کہ اجتہاد فی الاصول کا دروازہ بند ہو گیا اور اجتہاد فی الفروع اب بھی باقی ہے اور قیامت تک باقی رہے گا اگر اجتہاد فی الفروع بھی نہ ہو سکے تو شریعت کے نامکمل ہونے کا شبہ ہو گا جو کہ بالکل غلط ہے شریعت میں کسی قسم کی کمی نہیں قیامت تک جس قدر صورتیں پیش آتی رہیں گی سب کا جواب علماء ہر زمانہ کی شریعت سے نکالتے رہیں گے کیونکہ یہ جزئیات اگر کتب فقہ میں نہیں تو اصول و قواعد سب سے پہلے مجتہدین بیان کر چکے ہیں جن سے قیامت تک کے واقعات کا حکم معلوم ہو سکتا ہے۔

البتہ قرآن و حدیث سے اصول مستنبط کرنا یہ اب اجتہاد فی الاصول کی بندش نہیں ہو سکتا یہ خاص اجتہاد فی الاصول بعد چار سو برس کے ختم ہو گیا کیونکہ ادلہ تو جس قدر اصول و قواعد شریعت کے تھے وہ سب ائمہ مجتہدین بیان کر چکے انہوں نے کوئی قاعدہ چھوڑ نہیں دیا۔ دوسرے ان کے بعد اگر کسی نے اصول مستنبط بھی کئے تو وہ مستحکم نہیں۔ کہیں نہ کہیں ضرور لڑتے ہیں جس سے معلوم ہوتا ہے کہ اجتہاد فی الاصول کے لئے اب مایہ قابل ہی نہیں رہے یہ حضرات مجتہدین ہی کا خاص حصہ تھا کہ انہوں نے نصوص سے اس خوبی سے اصول مستنبط کئے جو کہیں نہیں لڑ سکتے۔ حضرت شاہ ولی اللہ صاحب رحمۃ اللہ علیہ نے ایک مقام پر لکھا ہے کہ ہدایہ کے اصول مسلم نہیں اس کا مطلب یہ نہیں کہ ہدایہ غیر معتبر کتاب ہے اس میں اصول غلط نقل کر دیئے گئے ہیں۔ بلکہ شاہ صاحب کی مراد یہ ہے کہ صاحب ہدایہ نے بعض اصول خود شریعت سے مستنبط کئے ہیں جن میں وہ ناقل نہیں ہیں سو وہ معتبر

نہیں باقی جزئیات اس کی سب معتبر ہیں۔ تو اب دیکھ لیجئے کہ صاحب ہدایہ باوجودیکہ بہت ہی بڑے شخص ہیں ان کی علمی شان ہدایہ ہی سے معلوم ہو سکتی ہے۔ واقعی اس کتاب میں بھی انہوں نے کمال کر دیا ہر مسئلہ کی دو دلیلیں بیان کرتے ہیں ایک عقلی۔ ایک نقلی۔ کیا ٹھکانا ہے وسعت نظر کا کہ جزئیات تک کو حدیث سے ثابت کرتے ہیں پھر حدیثیں گو بلا سند بیان کرتے ہیں مگر تقشیش کرنے سے کہیں نہ کہیں ضرور ملتی ہیں چاہے سند بڑا زین ہوں یا مسند عبد الرزاق میں۔ یہی ہیں ہوں یا مصنف ابن ابی شیبہ میں۔ کہیں ضرور ملیں گی ایک دو اگر نہیں تو ملن ہے مگر جس شخص کی نظر اس قدر وسیع ہو تو ایک دو حدیث جو ہم کو نہ ملی ہو اس سے یہ دعویٰ نہیں کیا جاسکتا کہ اس کی اصل ہی نہیں۔ یہ تو وسعت نظر کا حال ہے فہم کا تو کیا ٹھکانا ہے مخالفین کے دلائل کو بیان کرنا ان کا جواب دینا پھر اپنے مذہب کی دلیل بیان کرنا یہ ان کا خاص حصہ ہے مگر بایں ہمہ جو اصول کو خود حدیث و قرآن سے نکالتے ہیں ان کی بابت شاہ ولی اللہ صاحبؒ نے فیصلہ فرمادیا کہ وہ معتبر اور مسلم نہیں ہیں کہیں نہ کہیں ضرور ٹوٹے ہیں تو اجمال جن لوگوں کی وسعت نظر و فہم کو صاحب ہدایہ سے کچھ بھی مناسبت نہیں وہ کیا حدیث و قرآن سے اصول مستنبط کریں گے۔

اجتہاد فی الفروع بانی ہے

ہاں البتہ اجتہاد فی الفروع اب بھی باقی ہے مگر اس سے یہ لازم نہیں آسکتا کہ ہم بھی امام ابو حنیفہؒ اور امام شافعیؒ کی طرح مجتہد ہو گئے کیونکہ اصحاب

سیاست خوب جانتے ہیں کہ قانون بنانا قانون جاری کرنے سے بہت زیادہ دشوار ہے ہم لوگ سوائے اس کے کہ ان حضرات کے استنباط کردہ اصول کو حوادث الفتاویٰ میں جاری کر دیں اور کیا کر سکتے ہیں۔ کمال انہیں حضرات کا تھا کہ انہوں نے حدیث و قرآن میں غور کر کے ایسے اصول و قواعد سمجھے جو قیامت تک کے جزئیات کے لئے کافی ہیں کوئی مسئلہ ایسا پیش نہیں آسکتا جس کا حکم جواز و عدم جواز ان اصول سے نہ نکلتا ہو بلکہ ان حضرات نے صرف اصول و قواعد ہی پر اکتفا نہیں کیا۔ جزئیات بھی اس قدر نکال کر بیان کر گئے ہیں کہ بہت ہی کم کوئی مسئلہ ہوتا ہے جس کو وہ صراحت یا دلائل بیان نہ کر گئے ہوں اور اگر کوئی شاذ و نادر ایسا مسئلہ معلوم ہوتا ہے جو فقہاء نے نہیں بیان کیا تو کبھی توفیق کی نظر کی کوتاہی ہوتی ہے کہ اس کو سب مواقع پر عبور نہیں ہوتا۔ یا فہم کی کمی ہوتی ہے کہ وہ مسئلہ عبارت سے نکل سکتا ہے مگر مفتی صاحب

کی سمجھ میں نہیں آیا اور اگر بالفرض جرئیہ انہوں نے نہیں بیان کیا تو اصول سے تو وہ ضرور مستنبط ہوتا ہو گا پس آجکل یہ کسی کا منہ نہیں کہ اپنے کو ائمہ مجتہدین کے برابر کر سکے۔
(الجلار لاربتلاار صنا)

(۹۸) علم الاعتبار نکات و لطائف کے درمیں ہے

اور علوم جو بزرگوں نے قرآن سے نکالے ہیں ان کو یہ کہیں گے کہ منطبق علی القرآن ہیں مدلول قرآن نہیں ہیں یوں کہیں گے ثابت القرآن ہیں ہاں منطبق موافق کہیں گے۔ اور مدلول اور منطبق میں بڑا فرق ہے ایک مثال سے آپ کو اس کا فرق ظاہر ہو گا فرض کرو کہ ایک شخص کے پاس حجام آیا اور اس نے کہا کہ خط بنوایے اس نے جواب دیا کہ بڑھنے دو اتفاق سے جس وقت اس نے یہ جواب دیا تھا لڑکے والوں کی طرف سے دُوم بھی انکی لڑکی کی شادی کا خط لیکر آیا۔ وہ بھی اتفاق سے اس جواب سے اپنا مطلب نکال لے تو یہ جواب بڑھنے دو، دونوں سوالوں کا ہو سکتا ہے اول اس سوال کا اس طور پر کہ خط بڑھنے دو جب بڑھ جائے گا بنوایں گے دوسرے سوال کا اس طور پر کہ لڑکی ابھی چھوٹی ہے اس کو بڑھنے دو۔ پہلے معنی کو تو مدلول کہیں گے اور دوسرے کے مدعا پر اس کو صرف منطبق کہیں گے۔ قصہ تو یہ تھا کہ نالی کو جواب دیں لیکن یہ کلام کی لطافت ہے کہ وہ دُوم کا بھی جواب ہو گیا بس اس کو نکتہ اور لطیفہ کہہ سکتے ہیں یہاں سے ایک بات اور کام کی سمجھ میں آئی وہ یہ کہ صوفیہ کرام نے آیات کے متعلق کچھ بصورت تفسیر کے کہا ہے مثلاً اِذْهَبْ إِلَىٰ ذِي الْعَرْسِ الْمُنْتَهَىٰ کے متعلق لکھا ہے۔ اِذْهَبْ اِيهَا الرِّجَالُ إِلَىٰ النَّفْسِ الْمُنْتَطَفِیَّةِ وَادْبَحُوا بِقِرَّةِ النَّفْسِ تَوَانِ تَاوِيلُوهُ كَوْدِيْكُمْ كَرْدُوجَا عَتِيْثِ ہو گئی ہیں ایک تو جو صوفیہ کی محبت سے خالی ہیں اور بحاصل النصوص علیٰ ظواہرہا کے پورے پابند ہیں انہوں نے تو ان تاویلات کا بالکل انکار کر دیا کہ کہاں فرعون کہاں نفس۔ کہاں موسیٰ کہاں روح۔ یہ تو ایسا ہے کہ زمین بول کر آسمان مراد لیلیں اور صوفیہ کو اس بنا پر منال و محرف کہہ کر ان کے منکر ہو گئے کہ ان کو تو یہ ضرور ہوا کہ حضرات اہل اللہ کے برکات سے محروم ہوئے۔ دوسرے وقت تھے جو ان حضرات کی محبت میں عرق ہیں وہ یہ کہنے لگے

قرآن کا مدلول اور تفسیر یہی ہے علامہ غلام غفران نے فرمایا کہ اس میں تو سارا قصہ باطن کا ہے پھر اس بات میں غافلین کا یہاں تک غلو بڑھا کہ بعض جگہ تو انہوں نے قرآن مجید کی گت ہی بنا دی ہے۔ وائے لوگ بالکل ہی برباد ہوئے خدا کی قسم ہے کہ قرآن کا یہ مدلول ہرگز نہیں اس کا نتیجہ یہ ہوا کہ روزہ نماز سب اٹھ گیا اس لئے کہ تمام نصوص کے مدلولات کو بلکہ تمام شریعت کو ان لوگوں نے بدل دیا۔ لیکن اس وقت کلام ہے صوفیہ محققین کی تاویلات و اشارات میں۔ سو اس میں بعضے تو ان کے ہی منکر ہو گئے اور بعض حشرین کے منکر ہو گئے۔

اب رہ گئے ہم بیچ میں کہ ہم قرآن کو کلام اللہ اور صوفیہ کو اہل اللہ جانتے ہیں۔ تو دونوں کی اعانت و حفاظت کے لئے ضرورت ہوئی کہ ان تاویلات کو ایسے معانی پر محمول کیا جاوے کہ کلام اللہ کی بھی تحریف نہ ہو اور اہل اللہ کا کلام بھی خلل نہ تو اعدا شرعیہ نہ ہو۔ اس لئے ہم کہتے ہیں کہ صوفیہ کرام نے جو آیات کے معنی بیان کئے ہیں یہی ان واقع تفسیر نہیں ہے اور نہ وہ حضرات مدلول ظاہری کے منکر ہیں ان کی یہ مراد ہرگز نہیں کہ قرآن میں فرعون سے نفیس اور موسیٰ سے روح اور بقرہ سے نفس مراد ہے جو کچھ وہ فرما رہے ہیں یہ علم اعتبار کہلاتا ہے اور علم اعتبار یہ ہے کہ دوسرے کے حال پر اپنے حال کو بھی قیاس کر داس کی اسی مثال ہے جیسے زید نے ایک کام عمر کو دیکھا دیکھی کیا اور اس میں اس کو نا کامی ہوئی۔ تو اس موقع پر کہتے ہیں کہ کو اچلا ہنس کی چال اپنی بھی بھول گیا۔ تو اس کلام میں کوئے سے مراد زید اور ہنس سے مراد عمر یقیناً نہیں ہے۔ کوئے سے کوئے مراد ہے اور ہنس سے ہنس ہی مراد ہے۔ اور حاصل اس کا یہ ہے کہ دو موقعے ایک حالت کے اندر متطابق ہیں۔ ایک موقع پر جو نظر پڑی تو دوسرا موقع اس کو دیکھ کر یاد آگیا اور ایک کو دوسرے کے ساتھ تشبیہ دیدی۔ مثلاً یہاں زید و عمرو اور ان کے قصے کو کوئے اور ہنس سے تشبیہ دیدی پس اذہب ایہا الروح الخ سے مراد یہ ہے کہ قاری صاحب تو قرآن پڑھے۔ اور یہاں پہونچے تو اس قصے سے یہ سبق لو کہ تمہارے اندر بھی ایک چیز فرعون کے مشابہ اور ایک چیز موسیٰ کے مشابہ ہے قصے کو قصے ہی کے طور پر سمجھو بلکہ قرآن شریف کے ہر موقع سے اپنی حالت پر مطابقت کرتے جاؤ اور اس سے نصیحت اور عبرت حاصل کرتے جاؤ۔ یہ مطلب ہے صوفیہ کرام کا۔ پس دونوں فرقے غلطی پر ہیں جو ان تاویلات کا بالکل انکار کرتے ہیں وہ بھی غلطی پر ہیں اور جو ان کو تفسیر اور مدلول قرآنی قرار دیتے ہیں وہ تو بالکل

ہمارا طریقہ کار

اب دیکھنا چاہئے کہ اس باب میں ہماری کیا حالت ہے اور ہم کو اس طرف توجہ ہے یا نہیں۔ تو غور کرنے سے معلوم ہوتا ہے کہ ہم کو ادھر بالکل توجہ نہیں۔ اعتقاداً تو اس کو مامور بہ سمجھتے ہیں بلکہ اگر اس میں غور بھی کر کے دیکھا جائے تو معلوم ہوگا کہ جس درجہ کا یہ مامور بہ ہے اس درجہ سے بہت کم سمجھا جاتا ہے اس کو درجہ وجوب میں سمجھنے والے تو بہت ہی کم ہوں گے۔ کوئی مستحب سمجھتا ہے کوئی مستحسن۔ اور غضب یہ کہ مستحسن سمجھنے میں بھی قید لگاتے ہیں کہ مستحسن بھی جب ہے کہ کسی مصلحت سیاسیہ وغیرہ کے خلاف نہ ہو۔ ورنہ وہ بھی نہ وارد۔ اول تو یہی غضب تھا کہ بعض نے واجب کو مستحب سمجھا۔ پھر یہ دوسرا غضب ہے کہ اس میں یہ قید لگا دی کہ مصلحت کے خلاف نہ ہو۔ وہ کیوں؟ محض اپنے اغراض کے سبب۔ کیونکہ دینی کاموں میں بھی لوگ اول اغراض کی طرف دیکھتے ہیں کہ مسئلہ ان اغراض کے موافق ہے یا مخالف پھر وہ غرض جہاں فوت ہونے لگی کہہ دیا کہ اس وقت یہ کام مصلحت کے خلاف ہے لہذا مستحب بھی نہیں رہا۔ اب اس کو اصلاً مامور بہ نہیں سمجھتے بلکہ عجیب نہیں کہ ایک دن کسی مصلحت کی وجہ سے مامور بہ کو منہی عنہ بتلانے لگیں انہوں نے مسلمانوں سے یہ نہیں ہونا کہ اغراض کو احکام کے تابع بنائیں کہ اصل تو یہی ہے وہ سر انجام پائے پھر اغراض خواہ حاصل ہوں یا نہ ہوں۔ منکر انہوں نے یہ نہیں کرتے۔

ہی گئے گذرے ہیں یہ تاویلات اور لطائف اور نکات کے درجے میں ہیں۔ تفسیر نہیں ہیں اور ان کو علوم قرآنیہ نہیں کہہ سکتے علوم قرآنیہ وہی ہیں جن پر عبارت النص یا اشارۃ النص یا اقتضار النص یا دلالتہ النص سے استدلال ہو سکے ورنہ نکات و لطائف کا درجہ ہے۔

(الاتفاق منہ)

(۹۹) تبلیغ کو سیاسی اغراض کی وجہ سے ترک کرنا جائز نہیں۔

اب دیکھنا چاہئے کہ اس باب میں ہماری کیا حالت ہے اور ہم کو اس طرف توجہ ہے یا نہیں۔ تو غور کرنے سے معلوم ہوتا ہے کہ ہم کو ادھر بالکل توجہ نہیں۔ اعتقاداً تو اس کو مامور بہ سمجھتے ہیں بلکہ اگر اس میں غور بھی کر کے دیکھا جائے تو معلوم ہوگا کہ جس درجہ کا یہ مامور بہ ہے اس درجہ سے بہت کم سمجھا جاتا ہے اس کو درجہ وجوب میں سمجھنے والے تو بہت ہی کم ہوں گے۔ کوئی مستحب سمجھتا ہے کوئی مستحسن۔ اور غضب یہ کہ مستحسن سمجھنے میں بھی قید لگاتے ہیں کہ مستحسن بھی جب ہے کہ کسی مصلحت سیاسیہ وغیرہ کے خلاف نہ ہو۔ ورنہ وہ بھی نہ وارد۔ اول تو یہی غضب تھا کہ بعض نے واجب کو مستحب سمجھا۔ پھر یہ دوسرا غضب ہے کہ اس میں یہ قید لگا دی کہ مصلحت کے خلاف نہ ہو۔ وہ کیوں؟ محض اپنے اغراض کے سبب۔ کیونکہ دینی کاموں میں بھی لوگ اول اغراض کی طرف دیکھتے ہیں کہ مسئلہ ان اغراض کے موافق ہے یا مخالف پھر وہ غرض جہاں فوت ہونے لگی کہہ دیا کہ اس وقت یہ کام مصلحت کے خلاف ہے لہذا مستحب بھی نہیں رہا۔ اب اس کو اصلاً مامور بہ نہیں سمجھتے بلکہ عجیب نہیں کہ ایک دن کسی مصلحت کی وجہ سے مامور بہ کو منہی عنہ بتلانے لگیں انہوں نے مسلمانوں سے یہ نہیں ہونا کہ اغراض کو احکام کے تابع بنائیں کہ اصل تو یہی ہے وہ سر انجام پائے پھر اغراض خواہ حاصل ہوں یا نہ ہوں۔ منکر انہوں نے یہ نہیں کرتے۔

لوگوں کا حال

بلکہ بعض نے تو اغراض نفسانی کو پورا کرنے کے لئے کہ دعوت الی الاسلام کا نام فتنہ اور فساد رکھا ہے اور یہی وجہ ہے بے رحمی

کی کہ اس میں انہیں غرض کی وجہ سے بے حد تساہل کرتے ہیں حتیٰ کہ اپنی آنکھ سے بھی دیکھیں کہ کسی نے نماز میں تعدیل ارکان نہیں کی۔ اور ایسے بہت نکلیں گے تو ہماری یہ بہت نہیں ہوتی کہ اس سے اتنا کہیں کہ صل فانک لم تقبل۔ اور اس کی وجہ صرف اتباع ہوا ہے اس لئے باوجود علم کے محض دقیق تالیس گھر لیتے ہیں مگر خدا کے ساتھ یہ حیلہ و تزویر چل نہیں سکتا۔ بل الانسان علی نفسه بصيرة ولو القى معاذیرہ۔ اگر انصاف سے دیکھو تو معلوم ہوگا کہ اصل میں دنیا کو قبلہ و کعبہ بنا رکھا ہے امر بالمعروف نہ کرنے کی وجہ فقط اتنی ہے کہ اس سے دنیاوی اغراض فوت ہوتے ہیں دوستی نہیں رہے گی میل ملاپ نہ رہے گا ہنسی خوشی جاتی رہے گی اگر ہم نے کسی کو ٹوکا تو وہ ناخوش ہو جائے گا پھر ناخوش ہو کے آزار کے درپے ہو جائے گا پھر آزار سے ہم کو تکلیف ہوگی۔ اور یہ آزار و تکلیف بھی سب دہمی ہے۔ ایسے مواقع کے متعلق ذرا علماء سے تو دریافت کر لو کہ صاحب امر بالمعروف میں اگر ایسی باتیں پیش آئیں تو ایسی حالت میں ہم معذوریں یا نہیں۔ ان سے پوچھو تو کون کون سی چیزیں مسقط وجوب امر ہیں۔

امر بالمعروف کے آداب میں یہ نہیں کہتا کہ اس کا کوئی طریقہ ہی نہیں۔ اس کے لئے کوئی شرط و ضابطہ ہی نہیں ہے۔ برابر ہے اور ضرور ہے

مگر شرائط و ضوابط و آداب و اعذار علماء سے دریافت کرو۔ خود مفتی بن کر کیوں فتویٰ لگالیا کہ ہم تو معذوریں اور سچی بات تو یہ ہے کہ شرائط آداب کا طالب حقیقی بھی وہی ہوگا جس نے پکارا ارادہ امر بالمعروف و نہی عن المنکر کا کر لیا ہو۔ اس کو البتہ حق ہے شرائط و ضوابط پوچھنے کا۔ وہ اگر آداب و اعذار معلوم کرے تو اس کو سب کچھ بتلادیا جاوے گا باقی حالت موجود ہیں جبکہ اس کی طرف توجہ اور التفات ہی نہیں اس حالت میں آپ کو اعذار و شرائط پوچھنے کا اور سمجھنے کا بھی حق نہیں جو شخص کام کا ارادہ بھی نہ کرے اس کو نہ شرائط و ضوابط بتلائیے جائیں گے اور نہ اس کو آداب و اعذار پوچھنے کا حق ہے وجہ یہ ہے کہ وہ تو شرائط و اعذار اس لئے تلاش کرے گا تا کہ امر بالمعروف کرنا نہ پڑے بلکہ کسی طرح اس سے مخلصی اور رہائی مل جائے جب اعذار معلوم ہو جائیں گے تو کوئی نہ کوئی بات تراش لے گا کہ مجھ میں یہ عذر موجود ہیں یہ شرطیں مجھ میں نہیں پائی جاتیں ہم کیسے امر بالمعروف کریں اس لئے علماء کو چاہیے کہ قبل از شروع عمل کسی کو اعذار و شرائط

بتلایا ہی نہ کریں جیسے کوئی شخص نماز کا ارادہ ہی نہ رکھتا ہو اور علماء سے پوچھتا ہے کہ نماز کے شرائط و اعذار نہ بتانا چاہیے ورنہ وہ تو مسقط مصلوٰۃ کو ہر حالت میں تلاش کرے گا۔ ہر وقت اسی دھن میں رہے گا کہ کوئی بات ایسی ہو جس سے نماز پڑھنے سے چھٹی مل جائے۔ البتہ جس کا ارادہ ہو پڑھنے کا وہ پوچھے تو اس کو بیشک بتلادیا جاوے لیکن اگر یہ معلوم ہو جائے کہ محض مخلصی کا متلاشی ہے تو مفتی کو چاہیے کہ ایسے شخص کو ہرگز جواب نہ دے بلکہ میرے نزدیک ایسوں کو اعذار و موانع کی اطلاع کرنا جائز بھی نہ ہوگا۔ (آداب التبلیغ ص ۶)

(۱۰۰) حضرت منصور رحمۃ اللہ علیہ کے اناکھن کہنے کا راز۔

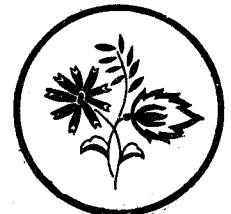
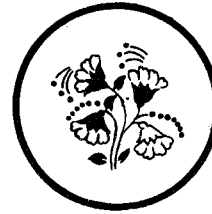
وہ اناکھن خود نہ کہہ رہے تھے بلکہ اس وقت ان کی وہ حالت تھی جیسے شجرہ موسیٰ سے آواز آئی تھی۔ اِنَّا اَنَّا اللّٰهُ رَبُّ الْعَالَمِیْنَ کو آواز شجرہ ہی سے نکل رہی تھی چنانچہ خود رض میں تصریح ہے مُوَدِّیْ مِنْ شَاطِئِ الْوَادِیْ اَیْمَنِ فِی الْبُقْعَةِ الْمُبَارَکَةِ مِنَ الشَّجَرَةِ اَنْ یَّامُوْسٰی۔ تو کیا شجرہ خود کہہ رہا تھا۔ اِنَّا اَنَّا اللّٰهُ ہرگز نہیں ورنہ شجرہ کا رب ہونا لازم آئے گا اور یہ بھی نہیں کہہ سکتے کہ وہ آواز شجرہ میں سے نہیں نکلی تھی بعینہ صوت حق تھی کیونکہ حق تعالیٰ صوت سے پاک ہیں اور یقیناً موسیٰ علیہ السلام کو صوت ہی مسموع ہوئی تھی جو سمت خاص اور مکان خاص کے ساتھ مقید تھی۔ تو اس کو حق تعالیٰ نے وادی ایں اور بقرہ مبارکہ اور من الشجرہ کے ساتھ مقید کیا ہے ورنہ کلام حق بعینہ ہوتا تو ان تیرے مقید نہ ہوتا۔ پس ماننا پڑے گا کہ وہ آواز تو شجرہ ہی کی تھی اور اسی میں سے نکلی تھی مگر وہ حق تعالیٰ کی طرف سے متکلم تھا خود متکلم تھا۔ جیسے قرآن میں حضور صلی اللہ علیہ وسلم کو ارشاد ہے فَاذْخُرْنَا فَاَنْتَیْمُ قُرْآنًا کہ جب ہم قرآن پڑھا کریں تو آپ قرأت کا اتباع کیجئے۔ یقیناً حضور صلی اللہ علیہ وسلم کسی صوت کو سنتے تھے۔ اور خدا کے تعالیٰ صوت سے منزہ ہیں پھر اس قرآن کا کیا مطلب ہے ہی کہا جاتا ہے کہ یہاں قرأت جبریل کو قرأت حق کہا گیا ہے کیونکہ وہ حکم حق قرأت کرتے تھے ایسے ہی

یہاں بھی قول بخیرہ کو قول حق کہا جاتا ہے کیونکہ اس نے جو کچھ کہا تھا بحکم حق کہا تھا پس یونہی منصور کے انا الحق کو خدا تعالیٰ کا قول کہنا چاہیے کیونکہ غلبہ حال میں کلام حق ان کی زبان سے نکلا تھا وہ بھی منظم بحکم حق تھے خود متکلم نہ تھے۔

ایک بزرگ کا واقعہ چنانچہ ایک بزرگ کے واقعہ سے اس کی تائید ہوتی ہے وہ یہ کہ ایک بزرگ نے حق تعالیٰ سے سوال کیا کہ منصور نے بھی اپنے خدا کو خدا کہا تھا اور فرعون نے بھی۔ وہ تو مقبول ہو گئے اور یہ مردود ہو گیا۔ اس کی کیا وجہ ہے۔ جواب ارشاد ہوا کہ منصور نے اپنے کو مٹا کر انا الحق کہا تھا اور فرعون نے ہم کو مٹا کر انا ربکم الاعلیٰ کہا تھا اس کا یہی مطلب ہے کہ منصور نے جو کچھ کہا تھا خود نہ کہا تھا کیونکہ وہ خود ہی کو مٹا چکے تھے۔ اسی کو مولانا فرماتے ہیں ۴

گفت فرعون نے انا الحق گشت پست گفت منصور انا الحق گشت مست
لعنت اللہ آں انار اور رفت رحمتہ اللہ ایں انار در و رفت

(المودة الرحمانہ ص ۳)



دستار علی ابن مختار علی۔

مالک مکتبہ تہانوی دیوبند سہارنپور۔

فہرست مضامین حصہ سوم

صفحہ	مضامین	صفحہ	مضامین
۳۰۳	کافر کو عذاب الہی ہونے پر شبہ کا جواب	۲۹۳	آسمان کے وجود پر دلیل
	احکام شریعت کی علتیں دریافت کرنا		فلاسفہ کے دلائل مخدوش
	اس بات کا ثبوت ہے کہ قلب میں عظمت	۲۹۳	شریعت سائنس متصادم نہیں
۳۰۳	حق نہیں۔	۲۹۳	جدید تعلیم یافتہ کا اسباب علم کو مؤثر
	احکام شریعت کو مصالح دنیوی کی بنا		حقیقی سمجھنا صحیح نہیں۔
۳۰۵	قرار دینا خطرناک مسلک ہے۔	۲۹۵	ایک مثال
۳۰۶	وضو کا انکار	۲۹۵	مؤثر حقیقی اللہ تعالیٰ ہے
۳۰۶	قربانی پر اعتراض	۲۹۶	باگل کا دعویٰ
۳۰۷	قانون عقل پر حاکم ہے	۲۹۶	خدا کا منکر بھی باگل ہے
۳۰۷	قربانی کا مقصد	۲۹۶	مسلمانوں کی حالت
	کعبہ کا بعض بزرگوں کے استقبال	۲۹۷	کثرت رائے کلیتہً حق ہونے کی دلیل نہیں
	کیلے جانے کی تحقیق، اور اس پر	۲۹۸	کثرت رائے کی کوئی حقیقت نہیں
۳۰۸	شبہات کا جواب۔	۲۹۹	صدیق اکبر رضی عنہ کی عزیمت
	جدید تعلیم یافتہ طبقہ کی اس غلطی کا جواب	۲۹۹	حضرت عمرؓ کو جواب دیا
۳۰۹	کہ اسلام میں سلطنت جمہوری کی تعلیم ہے	۳۰۰	مکہ معظمہ میں ہزاروں جانوروں کا ذبح
۳۱۰	خدا کے یہاں پر یس کہاں ہے		ہو جانا کیا خلاف عقل ہے؟
۳۱۰	قانون کی پابندی	۳۰۰	قربانی کی حقیقت
۳۱۱	پارلیمنٹ کی حیثیت	۳۰۱	جماعت غلام کو نکما سمجھنا صحیح نہیں
۳۱۲	ایک زمانہ میں دونوں	۳۰۱	مضویٰ اللہ علیہ وسلم کے پیچھے سے دیکھنے پر شبہ کا جواب
۳۱۲	قصہ سامری	۳۰۲	

صفحہ	مضامین	صفحہ	مضامین
۳۲۹	علماء ہند	۳۱۳	تابع اور قبوع
۳۳۰	ایک واقعہ	۳۱۳	شخصی حکومت
۳۳۰	ایک رئیس کا قصہ	۳۱۴	سرسید اور مولانا حمیدین میں مکالمہ
۳۳۱	انسانی کوشش	۳۱۴	کثرت رائے پر
۳۱۵	ہربات کی دلیل قرآن شریف سے طلب	۳۱۵	شخصی سلطنت
۳۳۲	کرنا غلطی ہے۔	۳۱۵	حضرت بریرہ رض کا واقعہ
۳۳۲	ایک عام غلطی	۳۱۶	مشورہ کا درجہ
۳۳۲	ایک مثال	۳۱۶	مشورہ پر عمل ضروری نہیں
۳۳۳	شریعت کے دلائل	۳۱۶	امن عام مکمل طور پر دین پر قائم ہونے سے
۳۳۳	حدیث رسول ص	۳۱۶	ہی حاصل ہو سکتا ہے۔
۳۳۳	اجماع امت	۳۱۸	عقائد
۳۳۴	قیاس	۳۱۹	مذہبی طاقت کی مثال
۳۳۴	صحیح دلیل	۳۱۹	خوف خدا کا اثر
۳۳۴	آزادی کے معنی	۳۲۰	اعمال کا دخل
۳۲۵	اس اعتراض کا جواب کہ علماء کو لیکچر دینا نہیں آتا۔	۳۲۰	خدا کی خدائی پر اعتقاد کا نتیجہ
۳۳۶	سادگی	۳۲۰	اعمال دین کے اثرات
۳۳۶	سادگی کے ساتھ صفائی	۳۲۲	عقائد و اعمال کی خاصیت
۳۳۶	اردو زبان کی خصوصیت	۳۲۳	دین میں تنگی اور دشواری نہیں ہے
۳۳۶	اصل اردو	۳۲۳	ایک حکایت
۳۲۵	ہم تہذیب میں دوسری قوموں کے محتاج نہیں ہیں	۳۲۳	دشواریوں کی قسمیں
۳۲۶	حضور صلی اللہ علیہ وسلم امریکہ تشریف نہیں لے گئے تو پھر حضور ص کی بعثت عام کیسے ہوئی؟	۳۲۵	ایک مثال
۳۲۸		۳۲۶	ایک اشکال اور اس کا حل
۳۲۸		۳۲۸	بندگی سے قوت آتی ہے
۳۲۹		۳۲۸	چاندی کا مسئلہ

صفحہ	مضامین	صفحہ	مضامین
۳۲۸	انسان محتاج محض ہے	۳۲۰	جب انسان کی تقدیر میں یہ لکھ دیا گیا
۳۲۹	محتاجی کی وجہ	۳۲۰	کہ وہ فلاں گناہ کرے گا تو پھر انسان مجرم کیوں؟
۳۲۹	اللہ تعالیٰ محتاج نہیں	۳۲۱	اللہ تعالیٰ نے مسلمانوں سے سلطنت
۳۲۹	شام ہزارہ ایران کا واقعہ	۳۲۱	چھین کر کفار کو کس لئے دیدی۔
۳۵۰	اس حکایت کا خلاصہ	۳۲۲	اس اعتراض کا جواب کہ سود کے بند
۳۵۰	پردہ مرقعہ پر اعتراض کا جواب	۳۲۲	کر دینے سے ہماری قوم پر تباہی
۳۵۱	عورت کا پردہ	۳۲۲	اگرگی۔
۳۵۱	پردہ تعلیم کیلئے مضر نہیں	۳۲۲	ترقی خوش معاہدگی میں ہے
۳۵۲	پردہ کی وجہ	۳۲۲	بد معاہدگی کا انجام
۳۵۲	پردہ کی اہمیت	۳۲۳	کیا تمام علوم قرآن شریف میں ہیں
۳۵۳	خود سرور کائنات کا عمل	۳۲۳	ہر تحقیق کی جستجو قرآن میں
۳۵۳	حضرت یوسف علیہ السلام کا قول	۳۲۳	درست نہیں۔
۳۵۴	نفس کی پاکی کا دعویٰ	۳۲۴	اس شبہ کا جواب کہ زکوٰۃ دینے
۳۵۴	ازواج مطہرات کا پردہ	۳۲۴	سے مال کم ہوتا ہے بڑھتا کہاں ہے۔
۳۵۴	علماء ترقی سے مانع نہیں ہیں	۳۲۴	اس شبہ کا جواب کہ دیندار لوگ
۳۵۵	ترقی محمود مطلوب ہے	۳۲۴	مصائب میں زیادہ مبتلا رہتے
۳۵۶	علماء پر غلط الزام	۳۲۴	ہیں۔
۳۵۷	ریل کا ایک واقعہ	۳	اہل اللہ کا حال
۳۵۷	علماء بتانے والے ہیں	۳۲۶	ناول بینی کی مضرتیں
۳۵۸	انسان کا مقصد	۳۲۶	ناول زیادہ نقصان دہ ہے
۳۵۸	عزت و مال مطلوب ہیں	۳۲۷	اس شبہ کا جواب کہ قرآن مجید میں
۳۵۹	حکایت وزیر بھوپال	۳۲۸	نکار مضامین کیوں ہے
۳۵۹	دین سے بے رغبتی	۳۲۸	نکار مضامین کی وجہ
۳۶۰	اس تکیہ کلام اور مشہور اعتراض کا جواب کہ فلاں بات خلاف عقل ہے		

آسمان کے وجود پر دلیل

اہل سائنس کا دعویٰ ہے کہ آسمان کا وجود نہیں، ستارے سب فضا میں گھوم رہے ہیں، تو دیکھو یہ مسئلہ طنی ہے یا یقینی، تو سائنس کی رو سے علم قطعی طور سے ثابت نہیں ہو سکتا۔ آج تک جتنی دلیلیں نفی آسمان پر قائم کی گئیں ان سب کا خلاصہ عدم العلم ہے جو کہ عدم وجود کو مستلزم نہیں اور وجود آسمان دلیل قطعی سے ثابت ہے کیونکہ وجود آسمان فی نفسہ ممکن ہے یعنی آسمان کا وجود عدم دونوں عقلاً برابر ہیں اور یہ عقلی مقدمہ ہے کہ جس ممکن کے وجود کی خبر کوئی تجربہ قطعاً صادق ہو، دیتا ہو تو اس ممکن کا وجود ثابت قطعی ہوتا ہے۔ اور اس کے وجود کی خبر ایک تجربہ صادق یعنی قرآن شریف نے دی ہے۔ پس ان تینوں مقدموں سے یہ بات قطعی طور پر ثابت ہو گئی کہ آسمان موجود ہے۔ اور آسمان کے ممکن الوجود ہونے کی بنا پر میں کہتا ہوں کہ جب یہ عقلاً ممکن ہے یعنی نہ واجب ہے اور نہ ممنوع، پس نہ ضروری الوجود ہوا نہ ضروری العدم تو عقل اس کے وجود یا عدم کی بابت کوئی فیصلہ کر ہی نہیں سکتی۔ زیادہ سے زیادہ اگر کہا جاسکتا ہے تو صرف اس قدر کہ ہم کو از روئے عقل وجود کا پتہ نہیں چلا اور معلوم ہے کہ عدم ثبوت اور ثبوت العدم میں زمین اور آسمان کا فرق ہے امریکہ کا وجود جس وقت تک ہم لوگوں کو ثابت نہ تھا اس وقت تک بھی ہم یوں نہیں کہہ سکتے تھے کہ امریکہ موجود نہیں ہے۔ البتہ یہ کہا جاسکتا تھا کہ ہم کو وجود امریکہ کا علم نہیں ہے۔ پس اہل سائنس یہ کہہ سکتے ہیں کہ ہم کو آسمان کے وجود کا پتہ نہیں چلتا اور یہ ہم کو مضر نہیں کیونکہ ہم تقریر سابق سے آن کو وجود آسمان تسلیم کرادیں گے۔ البتہ اس کے ضروری الوجود نہ ہونے پر شبہ ہوتا ہے کہ اہل یونان نے وجود آسمان پر عقلی دلائل قائم کئے ہیں۔

لے نہ ہونا آسمان کے نہ ہونے سے علم کا نہ ہونا بلکہ خبر دینے والا

صفحہ	مضامین	صفحہ	مضامین
۳۶۰	اس رائے کا جواب کہ مولوی سب	۳۶۰	اسلئے قابل قبول نہیں۔
۳۶۱	باہم متفق ہو جائیں تو سارا باہمی نزاع	۳۶۱	انسان کی پیدائش
۳۶۲	دور ہو جائے۔	۳۶۲	خلاف عادت اور خلاف عقل میں فرق
۳۶۳	اختلاف کی وجہ	۳۶۳	خلاف عادت اور خلاف عقل میں فرق
۳۶۳	دو عورت میں مساوات اور اس	۳۶۳	لوگوں کا موجودہ ذوق
۳۶۴	کا فیصلہ۔	۳۶۴	دینی اموری کی دلیل
۳۶۴	مرد و عورت کی خلقت میں فرق	۳۶۴	پل صراط پر چلنا
۳۶۸	تعلیم یافتوں کا حال	۳۶۴	کسی واقعہ کا ثبوت نظیر پر
۳۶۸	انتظام کا تقاضا	۳۶۵	موقوف نہیں۔
۳۶۹	عورتوں کو حاکم بنانا	۳۶۵	پل صراط کیا ہے
۳۸۰	اس شبہ کا جواب کہ غیر مسلم اگر مہذب	۳۶۶	دنیا میں اختلاف حالات
۳۸۱	ہوں تو ناجی کیوں نہیں۔	۳۶۶	ایک حدیث کی تشریح
۳۸۱	غیر مسلم کے ناجی نہ ہونے کی وجہ	۳۶۸	شریعت پر عمل
۳۴۹	حصہ سوم ختم شد	۳۴۹	عقل کی مثال
۳۴۹		۳۴۹	قانون سلطنت کیوں مانتے ہیں
۳۵۰		۳۵۰	کہیں عقل کو چھوڑنا بھی چاہیے
۳۵۱		۳۵۱	رسول ماننے کا حاصل
۳۵۱		۳۵۱	عقل کو چھوڑنا پڑتا ہے
۳۵۲		۳۵۲	محض عقل کافی نہیں ہے
۳۵۲		۳۵۲	افراط عقل کا نتیجہ
۳۵۳		۳۵۳	قوت شہوانیہ
۳۵۳		۳۵۳	قوت غضبیہ
۳۵۳		۳۵۳	اخلاق پسندیدہ
۳۵۳		۳۵۳	شریعت کی نزاکت

فلاسفہ کے دلائل مخدوش | اس کا جواب یہ ہے کہ فلاسفہ یونان کے دلائل قریب قریب سب مخدوش ہیں

جیسا کہ اہل علم پر مخفی نہیں، واقعیت یہی ہے کہ عقل سے نہ آسمان کا وجود ثابت ہوتا ہے نہ عدم، رہی یہ بات کہ علی العموم اس نیلگوں رنگ کو جو جانب فوق میں نظر آتا ہے آسمان سمجھا جاتا ہے۔ اور آج یہ بات ثابت ہو گئی ہے کہ یہ نیلگوں رنگ آسمان نہیں ہے۔

اس کے جواب میں میں کہتا ہوں کہ اول تو جن دلائل سے یہ ثابت ہوا ہے۔ وہ خود ابھی مخدوش ہیں اور بنا بر الفاسد علی الفاسد ہے۔ دوسرے اگر ثابت ہو چکے ہوں گے کہ یہ رنگ آسمان نہیں ہے تب بھی اس سے عدم وجود آسمان نہیں ثابت ہوتا۔ ممکن ہے کہ آسمان اس سے آگے ہو۔

شریعت سے سائنس متصادم نہیں | پس یہ کہنا کہ آسمان کا وجود جو کہ شریعت سے ثابت ہے

ہے دلائل سائنس سے متصادم ہے سخت غلطی ہے کیونکہ سائنس اس میں بالکل ساکت ہے اور قرآن شریف ناطق، اور تضادم و تعارض ناطقین میں ہوتا ہے۔ ساکت و ناطق میں نہیں ہو سکتا۔ اور جب تعارض نہیں ہے تو سمار کی تفسیر کو اکب یا ما فوتنا وغیرہ کرنے کی ضرورت نہیں اور یہ تفسیر یقیناً تحریف ہوگی۔ اور ایسے تحریفین کی بابت یہ کہنا صحیح ہے کہ انھوں نے وحی کو معیار نہیں بنایا کیونکہ باوجود وحی کو ماننے کے اس کی حقیقت سمجھنے میں غلطی کی۔

(تقویم الزیغ ص ۱۱)

(۲) جدید تعلیم یافتہ کا اسباب علم کو موثر حقیقی سمجھنا صحیح نہیں

جواب :- فرمایا، نئے خیال کے لوگ اسباب علم پر ایسے جمع ہیں کہ مسبب الاسباب کو چھوڑ ہی دیا۔ اسباب طبعیہ کے آثار کو لازم سمجھ کر تصرفات حق تعالیٰ کے منکر ہو گئے اور غلطی ان کی یہ ہوئی کہ کسی اثر کے دوام سے اس کا ضروری ہونا اعتقاد کر لیا مثلاً آگ کا اثر ہے جلانا۔ اس کے دوام سے یہ سمجھنا کہ یہ اس کا ذاتی اثر ہے انفکاک تصور نہیں اور سخت غلطی ہے۔ اسی وجہ سے انھوں نے قصہ ابراہیم علی نبینا وعلیہ الصلوٰۃ والسلام کے متعلق آیت قُلْنَا يَا نَارُ كُونِي بَرْدًا وَسَلَدًا۔ میں تاویلات بعیدہ کیس یہ سمجھ کر کہ آگ کیونکر جھنڈی ہو سکتی ہے۔

اس غلطی کی ایسی مثال ہے کہ ریل دواؤں کی اصطلاح میں گاڑی ایک مثال | روکنے کے لئے ٹرک جھنڈی ہوتی ہے ایک نادان بار بار اس کو دیکھ کر یہ سمجھنے لگے کہ خود اس جھنڈی میں یہ اثر ہے کہ اس سے گاڑی ٹرک جاتی ہے کیونکہ جب دیکھا تو ایسا ہی نظر آیا۔ اور جو لوگ حقیقت جانتے ہیں وہ کہیں گے کہ روکنے والا اصل میں ڈرائیور ہے باقی یہ جھنڈی محض علامت ہے اس میں کوئی اثر ذاتی نہیں۔ ایسے ہی بغیر حکم حق ایک ذرہ بھی حرکت نہیں کر سکتا۔ حتیٰ کہ زبان سے جو الفاظ نکلے ہیں ہر حرف پر حکم جدید ہوتا ہے تو زبان حرکت کرتی ہے تمام عالم میں ایسا ہی تصرف جاری ہے۔ انیسویں صدی میں نے دوام سے ضروری ہونا اعتقاد کر لیا اور تصرف حق کے منکر ہو گئے۔

(ملفوظ نمبر ۲۵ دعوات عہدیت حصہ ۲)

موثر حقیقی اللہ تعالیٰ ہے

بعض لوگ ایسے گھڑے والے ہیں جو مشیت حق ہی کے معتقد نہیں۔ بلکہ اسباب پر ہی ہر چیز کا مدار رکھتے ہیں حالانکہ حق تعالیٰ نے تعطیل اسباب فی بعض الاوقات کو جا بجا ظاہر فرمایا ہے۔ اور اگر اسباب کی حقیقت پر غور کیا جائے تو عقلاً بھی خدا تعالیٰ کی مشیت کو موثر ماننا ضروری ہے۔ کیونکہ میں کہتا ہوں کہ جس حادثہ کے لئے آپ نے ایک دوسری شئی کو سبب مانا ہو وہ سبب بھی تو ایک حادثہ ہے اس کے لئے کون سبب ہوا۔ اگر اس کے لئے آپ نے تیسری چیز کو سبب بنایا ہم اس میں بھی کلام کریں گے تو اس سلسلہ ممکنات کو لامحالہ واجب پر منتہی کیا جائے گا ورنہ تسلسل لازم آئے گا اور لامتناہی کے ابطال پر متکین دلائل قائم کر چکے ہیں۔ اور یہ حکما کی حماقت ہے کہ وہ اجزاء عالم کو حادث بالاشخص اور قدیم بالنوع کہتے ہیں کہ ہر فرد تو حادث ہے مگر نوع قدیم ہے حالانکہ وہ خود اس کے بھی قائل ہیں کہ نوع کا وجود بدوین شخص کے نہیں ہو سکتا۔ پھر جب ہر شخص حادث ہے تو نوع قدیم کا تحقق کیسے ہوگا۔ غرض دلائل عقلیہ سے بھی اور تقلید سے بھی مشیت حق کا موثر اصلی ہونا ہر طرح ثابت ہے۔ اور جو شخص ہر بات میں تسلیم ہی کا سبق پڑھے اس کا علاج متکین نے احرار بالناہر بتلایا ہے۔ نیز فطرۃ حق تعالیٰ کی ہستی اور قدرت ماننے کی چیز ہے۔ اور ماننے کی چیز کو نہ ماننا محکم ہے اور محکم کا تو کوئی بھی جواب نہیں۔

جیسے ایک مجنون پاخانہ کھا رہا تھا کسی نے ملامت کی۔ تو کہا اس میں حرج ہی کیا ہے یہ وہی تو ہے جو تھوڑی دیر پہلے ہم نے داخل کیا تھا اب وہ ہمارے اندر سے نکل کر برائیوں ہو گیا۔ ذرا عقلاً کسی عقلی دلیل سے اس کا جواب دیں مگر عروت اور طبیعت سے کام نہ لیں محض عقلی دلیل سے اس کے دعوے کو باطل کریں۔ میں سچ کہتا ہوں کہ اس کے ابطال پر وہ کوئی دلیل قائم نہ کر سکیں گے۔ مگر کیا اس سے کوئی یہ کہے گا کہ اس مجنون کی بات صحیح ہے؟ ہرگز نہیں، سببوں ہی کہیں گے کہ وہ نالائق یا گل ہے جو نہ ماننے کی چیز کو بھی نہیں مانتا جو اجماعاً ماننے کی چیز ہے۔

خدا کا منکر بھی یا گل ہے

اسی طرح ہم منکر صانع کو یا گل سمجھتے ہیں کیونکہ وہ بھی ایسی ماننے کی چیز کو نہیں مانتا جس کے

ماننے پر اجماع عقلاً و اتفاق مذاہب ہے اور ضرورت فطرت اس پر مزید، یہ تو کامل درجے کی دہریت ہے کہ خدا ہی کو نہ مانے اور ایک قسم کی دہریت یہ بھی ہے کہ خدا تعالیٰ کو تو مانے اور اس کی قدرت و مشیت کو کامل نہ مانے بلکہ یہ پہلی قسم سے بھی بدتر ہے کیونکہ یہ شخص خدا کا قائل ہے اور محض برائے نام قائل ہے۔ جیسے کوئی یوں کہے کہ فلاں بادشاہ تو ہے مگر پیشن یافتہ ہے کہ اسے اختیارات کچھ نہیں۔ چنانچہ بعض لوگ خدا تعالیٰ کو ایسا قادر مانتے ہیں جیسے گھڑی کا کوکنے والا کوک بھر دیئے کے بعد گھڑی کے چلنے میں اس کے اختیار کو کچھ دخل نہیں بلکہ وہ خود بخود چلی رہے گی چاہے کوک دینے والا زندہ ہو یا نہ ہو جب تک کوک بھری ہوئی ہے اس وقت تک گھڑی کو اس کی کچھ ضرورت نہیں۔ ایسے ہی یہ لوگ کہتے ہیں کہ حق تعالیٰ کا کام اتنا ہے کہ اسباب کو پیدا کر دیا اب اسباب سے مسبات اور علل سے معلولات کا وجود خود بخود ہوتا رہے گا۔ نعوذ باللہ اس تناؤ و تاثیر میں حق تعالیٰ کا کچھ بھی اختیار نہیں وہ اسباب سے سبب کو مختلف نہیں کر سکتے۔ بس ان لوگوں کا خدا کو ماننا ایسا ہے جیسے بعض لوگ۔ من تشبہ بقوم فهو منهم، سے بچنے کیلئے کوٹ پتلون اور بوٹ سوٹ کے ساتھ ترکی ٹوپی پہنتے ہیں کہ ساری ہیئت کو کفار کی سی ہے صرف ٹوپی سے آپ مسلمان معلوم ہوتے ہیں۔ ایسے ہی یہ لوگ حق تعالیٰ کے لئے قدرت و اختیار تو ایسا ضعیف مانتے ہیں جیسا کہ دہری منکر صانع مانتا ہے کیونکہ جیسا اختیار یہ مان رہے ہیں وہ بھی ماننے کے مثل ہے مگر الزام دہریت سے بچنے کیلئے برائے نام یوں کہتے ہیں کہ خدا موجود ہے۔ اور بعض لوگ خدا تعالیٰ کو بھی مانتے ہیں اور انکی قدرت و اختیار کو کامل بھی مانتے ہیں جیسے عامہ مسلمین۔

مسلمانوں کی حالت

مگر سچ یہ ہے کہ یہ بھی محض زبان ہی سے خدا تعالیٰ کی قدرت کو کامل کہتے ہیں دل سے یہ بھی کامل نہیں مانتے چنانچہ

مصاب و حوادث میں ہم اپنے قلب میں وہی ضعف پاتے ہیں جو قائل دہریت کے قلب میں ہوتا ہے ہم نے مانا کہ طبیعت کا بھی ایک اقتدار ہوتا ہے مگر پھر بھی طبیعت کے اقتدار میں اعتقاد کی وجہ سے کچھ توفیق ہونا چاہئے۔ جیسے گرم پانی جو بہت گرم ہو جس کی حرارت ناگوار ہو اس میں ٹھنڈا پانی مل جانے سے کچھ توفیق ضرور ہوتا ہے اب حرارت ناگوار نہیں ہوتی اسی طرح اعتقاد قدرت الہیہ کی برودت سے طبعی قلبان میں کچھ تو کمی ہونا چاہئے۔ ہاں اگر کوئی یہ کہے کہ فرق تو ہے مگر جو کچھ ہمارا اقرار ضعیف ہے اس لئے اس فرق کا ظہور نہیں ہوا جیسے گرم پانی کے ایک ٹکے میں لوٹا بھر ٹھنڈا پانی ملا جائے تو پہلے سے گرمی میں کمی تو ضرور ہوگی مگر اس کا احساس بھی نہ ہوگا۔ میں تو کہتا ہوں کہ

جوشے اپنے اثر سے خالی ہو وہ معتبر نہیں جس چیز پر غایت مرتب نہ ہو وہ غیر معتبر ہے۔ اسلئے یہ اعتقاد جس کا اثر کچھ بھی ظاہر نہیں ہوتا معتبر نہیں دنیا میں تو اس سے کچھ نفع نہیں ہوگا گو آخرت میں کسی مدت کے بعد کام آجائے۔
(خیر الحیات و خیر الممات ص ۵)

(۳) کثرت رائے کیلئے حق ہونے کی دلیل نہیں

جواب (۱) :- آج کل یہ عجیب مسئلہ نکلا ہے کہ جس طرف کثرت رائے ہو وہ بات حق ہوتی ہے۔ صا جو! یہ ایک حد تک صحیح ہے مگر یہ بھی معلوم ہے کہ رائے سے کسی کی رائے مراد ہے۔ کیا ان عوام کا لانا نام کی؟ اگر انھیں کی رائے مراد ہے تو کیا وجہ ہے کہ حضرت ہود علیہ السلام نے اپنی قوم کی رائے پر عمل نہیں کیا۔ ساری قوم ایک طرف رہی اور ہود علیہ السلام ایک طرف۔ آخر انھوں نے توحید کو چھوڑ کر کیوں بت پرستی اختیار نہ کی، کیوں تقریق قوم کا الزام نہ لیا۔ اسی لئے کہ وہ قوم جاہل تھی اس کی رائے جاہلانہ تھی۔ آج کل علماء پر یہی الزام لگایا جاتا ہے کہ انھوں نے قوم میں پھوٹ ڈال دی یہ اتفاق نہیں ہونے دیتے۔ (فضائل العلم و الخشہ ص ۳)

جواب (۲) :- (غزوہ اہد میں) ان پچاس آدمیوں میں دو پہاڑ کی گھاٹی پر متعین کر دیئے گئے تھے، اختلاف ہوا۔ بعض نے کہا کہ ہمارے بھائیوں کو فتح حاصل ہوگئی ہے اب ہم کو گھاٹی پر رہنے کی ضرورت نہیں۔ حضور صلی اللہ علیہ وسلم نے جس غرض کیلئے ہم کو یہاں متعین کیا تھا وہ غرض حاصل ہو چکی اسلئے حکم قرار بھی ختم ہو گیا۔ اب یہاں سے ہٹنے میں حضور کے مقصود کی مخالفت نہ ہوگی اور ہم نے اب تک جنگ میں کچھ حصہ نہیں لیا تو کچھ ہم کو بھی کرنا چاہئے ہمارے بھائی کفار کا قتل کر رہے ہیں ہم کو مال غنیمت جمع کر لینا چاہئے۔ بعض نے اس رائے کی مخالفت کی اور کہا حضور نے صاف فرما دیا تھا کہ بدوں میری اجازت کے یہاں سے نہ ہٹنا۔ اسلئے ہم کو بدوں آپ کی اجازت کے ہرگز نہ ہٹنا چاہئے۔

مگر پہلی رائے والوں نے نہ مانا اور چالیس آدمی گھاٹی سے ہٹ کر مال غنیمت جمع کرنے میں مشغول ہو گئے۔ یہ ان سے اجتہادی غلطی ہوئی اور گھاٹی پر صرف دس آدمی اور ایک افسران کے رہ گئے۔

(اس واقعہ میں کثرت رائے پر غلطی اور تقلید رائے صواب پر تھی)

جو لوگ کثرت رائے کو علامت حق سمجھتے ہیں وہ اس سے سبق حاصل کریں۔ (ذم النبیان ص ۱۲)

صرف کثرت رائے کی کوئی حقیقت نہیں

کے وصال کے بعد کچھ قبائل مرتد ہو گئے تھے جن میں بعض تو مسیلہ کذاب وغیرہ مدعیان نبوت کے ساتھ ہو گئے تھے۔ اور بعض لوگ کسی کے ساتھ تو نہیں ہوئے بلکہ ظاہر میں اپنے کو مسلمان کہتے رہے۔ توحید و رسالت کے مقرر ہے۔ کعبہ کو قبلہ مانتے رہے۔ نماز کی فرضیت کے قائل رہے۔ مگر زکوٰۃ کی فرضیت سے منکر ہو گئے اور یہ کہا کہ فرضیت زکوٰۃ صرف حضور صلی اللہ علیہ وسلم کے زمانہ سے مخصوص تھی، اب فرض نہیں اور علت یہ بتلائی کہ حضور کے زمانے میں مسلمانوں پر فقر زیادہ تھا۔ اسلئے اس وقت زکوٰۃ کی ضرورت تھی۔ اب وہ حالت نہیں رہی اسلئے فرضیت بھی باقی نہیں رہی۔ جیسے آج کل بھی بہت سے لوگ اس قسم کی تاویلیں کیا کرتے ہیں۔

پہلی جماعت کے بارہ میں سب صحابہ کی بالاتفاق یہ رائے تھی کہ ان کے ساتھ جہاد کیا جائے مگر دوسری جماعت کے حق میں سب کی رائے نرم تھی۔ حتیٰ کہ حضرت عمر رضی اللہ عنہ کی بھی یہ رائے تھی کہ ان کے ساتھ نرمی کی جائے اور جو کھلے کافر ہیں صرف ان سے لڑائی کی جائے۔ ان لوگوں پر جہاد نہ کیا جائے۔

صدیق اکبر کی عنایت

حضرت صدیق اکبر رضی اللہ عنہ کی رائے اس دوسری جماعت کے متعلق بھی وہی تھی جو اور مرتدین کے متعلق تھی وہ ان لوگوں کو کافر کہتے تھے اور یہ فرماتے تھے کہ جو شخص نماز اور زکوٰۃ میں فرق کرے گا میں اس کے ساتھ قتال کروں گا۔ حضرت عمر رضی اللہ عنہ کہتے تھے کہ یہ لوگ تو لا الہ الا اللہ محمد رسول اللہ کہتے ہیں۔ ہمارے قبلہ کی طرف نماز پڑھتے ہیں ان پر کیونکر جہاد ہو سکتا ہے۔ اور ان کو کفار کی طرح کیسے قتل کیا جاسکتا ہے۔ حضرت صدیق رضی اللہ عنہ فرمایا کہ یہ سب کچھ سہی مگر یہ لوگ نماز اور زکوٰۃ میں فرق کرتے ہیں کہ نماز تو فرض مانتے ہیں اور زکوٰۃ کو فرض نہیں مانتے حالانکہ شریعت نے دونوں کو فرض کیا ہے تو یہ لوگ فرض قطعی کے منکر ہیں اور ان لوگوں نے دین کو بدل دیا ہے اور حضور کا ارشاد ہے من بدل دینہ فاقتلوا، اس لئے میں ان کے ساتھ قتال کروں گا۔

حضرت عمرؓ کو جواب دیا

حضرت عمر رضی اللہ عنہ نے پھر کہا کہ آپ کلمہ گو آدمیوں سے کیسے قتال کریں گے؟ حضرت صدیق رضی اللہ عنہ نے فرمایا اِجْبَارِیَی الْمَاجَہِلِیۃَ خَوَارِیَی الْمَاسِلَامَ، وَاللّٰہُ یُؤْمِنُ عِقَالًا وَفِی رَوَاۃٍ عَنَاۡقَا کَا نَوَاۡیِدُ وَنَدَۡۤاۡلِی رَسُوْلُ اللّٰہِ صَلَّی اللّٰہُ عَلَیْہِ وَسَلَّم لَا قَاتِلَ لَہُمْ عَلَیْہِ۔

ترجمہ :- اے عمر! یہ کیا کہ تم جاہلیت میں تو زبردست تھے اور اسلام میں اتنے بوسے ہو گئے۔ بخدا اگر یہ لوگ ایک رسی کو یا بکری کے بچہ کو بھی روکیں گے جو رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کو دیا کرتے تھے تو میں اس پر بھی ان سے قتال کروں گا۔ اور یہ بھی فرمایا کہ جب یہ آیت نازل ہوئی اِنَّ اللّٰہَ مَعَنَا تو رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے ساتھ اس وقت میں بھی تھا۔ تو خدا تعالیٰ میرے ساتھ بھی ہیں اگر میں تنہا بھی جہاد کو نکل کھڑا ہوں گا تو خدا تعالیٰ میرے ساتھ ہیں انشاء اللہ میں تمام دنیا پر غالب آؤں گا۔ کیا انتہا ہے اس قوت قلب کی۔

چنانچہ پھر سب صحابہ حضرت صدیق رضی اللہ عنہ کی رائے پر متفق ہو گئے۔ اس واقعہ کو بھی ان لوگوں کو سبق حاصل کرنا چاہئے جو کثرت رائے کو علامت حق سمجھتے ہوئے ہیں۔ (ذم النبیان ص ۳)

۴) مکہ معظمہ میں ہزاروں جانوروں کا ذبح ہو جانا کیا خلافِ عقل ہے؟

جواب اس کا یہ ہے کہ جناب من ہے تو بخش بات لیکن تفہیم کے لئے عرض ہے کہ اگر تمہاری عقل میں کسی شے کا نہ آنا خلافِ عقل ہونے کی دلیل ہے تو ہمارا آپ کا پیدا ہونا جبر طریق سے ہے وہ بھی عقل کے خلاف ہے اور اس کا امتحان یہ ہے کہ ایک بچہ ایسا جو زکریا جانا ہے کہ وہ تہہ خانے میں پرورش کیا جائے اور اس کے سامنے کبھی اس کا تذکرہ نہ کیا جائے کہ آدمی

کس طرح پیدا ہوتا ہے حتیٰ کہ جب بیس برس کا ہو جائے تو اس سے دفعۃً کہا جائے کہ آدمی اس طور سے پیدا ہوتا ہے تو ہرگز اس کی عقل میں نہ آئے گا اور ہم چونکہ رات دن دیکھتے ہیں کہ جناب ہم تو جب سے پیدا ہوئے ہیں ہمارے تمام حالات ہی خلافِ عقل ہیں۔ ہماری عقل تو بس کھانے کمنے کی ہے۔ ایسے ہی جیسے کسی بھوکے سے پوچھا تھا کہ دو اور دو کتنے ہوتے ہیں کہا چار روٹیاں ایسے ہی ہماری عقل صرف اس قدر ہے کہ کھالو اور پی لو، اور باتیں بناو۔ جب اتنی عقل ہے تو اسرارِ شریعت کہاں تک سمجھ میں آئیں۔

ایسے ہی نفس الضعیف بلا تقسیم لحم کے بھی حکمت ہے۔ اگر ہماری عقل میں نہ آئے تو قابلِ انکار کیسے ہوگی۔ اور اس لئے ہمارے ذمہ ضروری نہیں ہے کہ اس حکمت دراز کو بیان کریں لیکن تبرعاً بتائے دیتے ہیں۔

قربانی کی حقیقت

وہ یہ ہے کہ اصل میں یہ سنتِ ابراہیمی کا اتباع ہے۔ اور شے محبوب کا انفاق مقصود ہے اور وہ صرف جانور ذبح کر دینے سے حاصل ہو جاتا ہے۔ گوشت خواہ رکھیں یا تقسیم کریں۔

دوسری بات یہ ہے کہ اصل عمل تو یہ تھا کہ بیٹے کو ذبح کریں لیکن اول تو سب کے بیٹا ہوتا نہیں۔ دوسرے یہ کہ اگر یہ حکم ہوتا تو بہت کم ایسے نکلے جو بیدل کرتے۔ یہ حق تعالیٰ کا فضل ہے کہ جانور کو قائم مقام ذبح و لد کے کر دیا۔ اس لئے یہ کہنا کہ قربانی میں مال ضائع کرنا ہے جیسے آجکل تو تعلیم یافتہ اصحاب کا خیال ہے سراسر غلط ہے اور قربانی کا مقصود اظہارِ محبت ہے اللہ تعالیٰ کے ساتھ اور وہ اس میں حاصل ہے پھر مال کہاں ضائع ہوا۔ (ترغیب الاضعی ص ۱۲)

۵) جماعت علماء کو نکما سمجھنا صحیح نہیں

برسبیلِ معظ بیان فرمایا کہ آج کل لوگوں نے علماء کی جماعت کو کم ہمت بیکا رونکی پلٹن اور کیا کیا خطاب دے رکھے ہیں۔ حالانکہ تجربہ سے معلوم ہوا ہے کہ عربی پڑھنے سے دماغ میں ایک خاص انجلا ہو جاتا ہے۔ فرض کیجئے اگر دو شخص یکساں دماغ کے انگریزی پڑھیں اور ایک ان میں عربی بھی پڑھا ہوا ہو صرف انگریزی پڑھے ہوئے سے تقریر و تحریر و دہن میں

طرف لڑتی ہے اسلئے صورت نظر پڑتی ہے جب نگاہ نہ کی تو شعاع نہ نکلی۔ تو پھر نظر آنے کا کوئی سبب نہیں۔ غرض آئینہ میں جو نظر آتا ہے وہ کوئی مابین چیز نہیں بلکہ اس چہرہ پر نگاہ لوٹ کر پڑتی ہے جب مرئی سے اپنی شعاعوں کا تعلق علت ہے رویت کی، پس اگر کسی شخص کو یہ قوت حاصل ہو کہ سیدھی شعاعوں کو مقوس کر کے تو اس کو پیچھے سے بھی مثل سامنے کے نظر آئے گا۔ چنانچہ صوفیہ کے بعض اشغال میں سرف نظر آنے لگتا ہے۔ اور رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم پیچھے سے بھی دیکھتے تھے۔ اور اس کی وجہ میں بعض علماء کہتے ہیں کہ آپ کے سر میں پیچھے کی جانب دو سوراخ تھے ان سے نظر آتا تھا تو اس کی کوئی ضرورت نہیں بلکہ ممکن ہے کہ آپ کو اللہ تعالیٰ نے شعاعوں کے مقوس بنانے کی قوت مرحمت فرمائی تھی۔ جب آپ قصد فرماتے آگے دیکھ لیتے اور پیچھے کا قصد کرتے تو پیچھے نظر فرمایا لیتے ہر شخص میں یہ قوت نہیں اسلئے نظر نہیں آتا۔ اور اس توجیہ کو حضرت مولانا محمد یعقوب صاحب قدس سرہ نقل فرماتے ہیں۔ (ملفوظ نمبر ۷۵ ایضاً)

۴) کافر کو عذاب دائمی ہونے پر شبہ کا جواب

جواب ۱) :- بر سبیل وعظ فرمایا کہ کافر کو جو ابدی عذاب ہے اس میں کوئی ظلم نہیں کیونکہ کافر اللہ کے ہر ہر صفت کے حقوق ضائع کرتا ہے اور اس کی صفات لامتناہی ہیں اور خود ہر صفت کے حقوق بھی غیر متناہی ہیں تو چاہئے تو یہ تھا کہ ہر صفت کے انکار پر لامتناہی سزا ہوتی اور پھر ہر صفت کے حقوق پر اسی طرح غیر متناہی سزا ہوتی پھر زیادتی کہاں ہوئی۔ بلکہ ایک معنی کر کے کہی ہے۔ بغاوت کی سزا قید دائمی ہی ہوتی ہے جس کا دوام حکام ظاہری کے اختیاریں ہے یعنی تاحیات وہ اپنے باغیوں کے لئے مقرر کرتے ہیں۔ اور جس قسم کا دوام احکام الحاکمین کے اختیار میں ہے یعنی اصلی، وہ اپنے باغیوں کے واسطے تجر زفر مائیں گے اس میں ظلم اور زیادتی کچھ بھی نہیں بلکہ عین عدل ہے۔ (مجادلات معطل نمبر ۲ حصہ ایضاً)

جواب ۲) :- سزا مناسب جنایت ہونی چاہئے اور یہاں جنایت متناہی ہے کیونکہ عمر کافر کی متناہی ہے تو سزا بھی متناہی ہونی چاہئے اس کا جواب حصہ اول میں گزر چکا۔

مقابلہ ضرور زیادہ ہوگا۔ چنانچہ ایک عربی پڑھے ہوئے تھے ان کے فیصلے نہایت مدلل اور پر زور ہوتے تھے ہم لوگ عربی پڑھے ہوئے اگر دنیا کمانے پر آئیں تو آپ لوگوں سے اچھی کما دکھائیں تو فہم کے متعلق تو یہ گفتگو تھی۔ رہی کم ہمتی، اس کا شبہ اس سے ہوتا ہے کہ یہ لوگ بہت روپے نہیں کمانے قلیل پرتناعت کرتے ہیں تو اس کا جواب ایک سے سمجھ لیجئے۔

اگر کوئی شخص آپ کے یہاں لوکر ہو اور صرف پانچ روپے کما ہو اور پاتا ہو اور کوئی دوسرا شخص اس کو بیس روپے دینے لگے لیکن وہ یہ کہدے کہ مجھ کو تو یہ پانچ روپے ہی اچھے ہیں آپ نے آقا کو نہ چھوڑوں گا تو بیچ کہئے کیا آپ اس کو کم ہمت اور بیکار کا خطاب دیں گے؟ نہیں بلکہ آپ اس کو کہیں گے کہ بڑا عالی ہمت اور وفادار شخص ہے کہ بیس روپیہ پر ملازمت ماردی اور اپنے آقا کو نہ چھوڑا۔ اور اس کے پانچ ہی روپیوں پر قناعت کی۔ پھر تعجب کی۔ ان لوگوں کو جو علم دین کی خدمت میں رہتے ہیں کیونکہ کم ہمت اور بیکاروں کی پلٹن دیرہ کے خطاب ملتے ہیں حالانکہ جیسا اوپر کہا گیا اگر یہ مولوی لوگ دنیا کمانے پر آجائیں تو آپ لوگوں سے اچھی کما دکھائیں لیکن پیر باد جو قدرت کے دنیاوی منافع کو چھوڑ کر دین کی خدمت میں لگے ہوئے ہیں اور دکھے سیکھے ٹکڑوں میں خوش ہیں تو ان کو کیوں عالی ہمت اور وفادار اپنے آقا یعنی خداوند کریم کا نہیں کہا جاتا۔ آپ لوگ خدمت علماء اور اہل دین کی کرتے ہیں۔ یہ نہ سمجھئے کہ ہمارا احسان ہے۔ آپ تو محض خزانچی ہیں اور خزانچی جو بڑے بڑے عہدہ داروں اور اہل کاروں کی تنخواہیں تقسیم کرتے ہیں یہ ان کا کوئی احسان نہیں ہے بلکہ خزانہ سرکاری ہے۔ خزانچی تو ایک چھوٹی سی تنخواہ کا ملازم ہے اس کے سپرد ہی یہ خدمت ہے اللہ تعالیٰ اپنا حکم بھیجتا ہے اور گردن دبا کر آپ کے ذریعہ سے ان بزرگوں کو اپنا عطیہ پہنچاتا ہے آپ کا کوئی احسان نہیں۔ (ملفوظ نمبر ۱۴۔ دعوات عبدیت حصہ سوم)

۵) حضور صلی اللہ علیہ وسلم کے پیچھے سے دیکھنے

پر شبہ کا جواب

فرمایا۔ آئینہ میں صورت جب تک نظر آتی ہے جب تک کہ آنکھ کسی دیکھنے والے کی کھلی ہوئی ہو کیونکہ نظر آنے کی حقیقت یہ ہے کہ شعاع آنکھ سے نکل کر آئینہ پر پڑ کر پھر رائی کی

(۸) احکام شریعت کی علتیں دریافت کرنا اس بات کا ثبوت ہے کہ قلب میں عظمت حق نہیں

صاحبو! دین کو لوگوں نے تحفہ مشق بنا لیا ہے کہ لوگ اپنی رایوں کا احکام میں دخل دیتے ہیں اور ان کی علتیں گھڑتے ہیں اور علماء سے بھی اس طرح سوال کرتے ہیں کہ امر اس طرح کیوں ہے سو دینا کیوں حرام ہے، فلاں بات کس لئے منع ہے۔ پھر فرمایا کہ میں نے ایک موقع پر اس کے متعلق یہ بیان کیا تھا کہ یہ بات تو مسلم ہے کہ اگر کسی مکان میں ماہرین علوم جدیدہ بیٹھے ہوں اور انجمن صاحب آں کریوں کہیں کہ فوراً اٹھو، یہ مکان گرا چاہتا ہے تو کچھ بھی تامل ٹھننے میں نہ کریں گے اور علت نہ پوچھی جائے گی اس وجہ سے کہ وہ جانتے ہیں کہ وہ ایسے فن سے واقف ہیں جو ہم نہیں جانتے اسلئے انکے حکم کی قدر کی جاتی ہے اور اس لئے ان کے کہنے کے موافق عمل کرنے میں تامل نہیں کرتے، نہ علت تلاش کرتے ہیں نہ اس سے علت پوچھتے ہیں بلکہ حکم کی تعمیل کے واسطے تیار ہو جاتے ہیں۔ یا رسول سرجن صاحب اگر اگر کوئی دوا بتائیں تو اس میں کچھ بھی چون و چرا نہیں کرتے۔ جانتے ہیں کہ یہ اس فن کا ماہر ہے۔ سمجھنے کی بات ہے کہ جس فن سے یہ لوگ واقف نہیں اس میں لم اور کیف سے کس لئے دخل دیتے ہیں ہم دیکھتے ہیں کہ کسی کی عظمت مانع ہوتی ہے اس کے احکام کی علت ڈھونڈنے سے۔ اس کی نظیر ایسی سمجھ لیجئے کہ ایک تو کوئی دوست برابر کے مرتبہ کا حکم کرے تو اس کی علت پوچھتے ہیں کہ تم نے یہ حکم کس لئے دیا۔ اور ایک حاکم کی طرف سے کوئی حکم صادر ہو تو ہرگز علت نہیں پوچھتے۔ وجہ یہ ہے کہ دوست کی عظمت اتنی طلب میں نہیں۔ ایک معمولی چیز ہے۔ اور احکام کی عظمت ہے اس لئے حجت نہیں کرتے۔ سو جب خدا تعالیٰ کے احکام کی علل دریافت کی جاتی ہے اس سے پوشیدہ پڑتا ہے کہ ان کے دل میں حق تعالیٰ کی عظمت نہیں ہے۔ بغرض محکوم ہونے کی حیثیت سے علل دریافت کرنا عقلاً بیہودہ امر ہے۔ ہاں طالب علمی کی حیثیت سے بغرض تحقیق فن مضائقہ نہیں۔ مگر وہ منصب صرف طالب علموں کا ہے۔ چنانچہ طلبہ اور شاگرد اساتذہ سے بڑی بڑی جتیں کرتے ہیں۔ سنو! اس کیلئے تعلیم فن کی ضرورت ہے۔ ہمارے پاس اگر ترتیب وار پڑھو۔ پھر اپنے وقت جو امر سمجھنے کا ہے وہ سمجھ لیں اور خود جائے گا۔ دریافت کی بھی ضرورت نہ ہوگی۔

خیال تو کیجئے، کلکٹر کا منادی اگر جب حکم سے اطلاع کرتا ہے تو کوئی علت نہیں پوچھتا، افسوس ہے علماء کو بھنگی سے بھی زیادہ ذلیل سمجھنے لگے ہیں۔ علماء درحقیقت منادی کرنے والے اور ناسل احکام ہیں خود موجود احکام نہیں اس لئے ان سے علتیں پوچھنا حماقت نہیں تو کیا ہے۔ پھر جب آپ نے ایک فن سیکھا نہیں اور آپ اس سے محض ناقت ہیں تو آپ کو سمجھانا بھی تو ایسا ہی ہو گا جیسے ایک سائیس کو اقلیدس کی اشکال سمجھانے لگیں۔ تودہ کیا سمجھے گا؟ اس کی تدبیر تو یہی ہے کہ پہلے اسکو اقلیدس کے مبادی سمجھا دو۔ جو اشکال کی موقوف علیہ ہیں پھر اشکال سمجھاؤ تو خوب سمجھے گا۔ علماء آجکل اپنے کی وجہ سے لوگوں کی رائے پر چلنے لگے ہیں جس سے عوام کی جرأت بڑھ گئی ہے۔ ایسا نہیں چاہئے۔ علماء کیا نوکر ہیں کہ بے فائدہ دماغ خالی کریں۔

(مجادلات معدلت نمبہ حصہ سوم دعواتِ عبدیت)

(۱۹) احکام شریعت کو مصلح دنیوی کی بنا قرار دینا خطرناک مسکک ہے۔

اس طرز تقریر میں زہر بھرا ہوا ہے جو اس کو جان لے گا وہ سمجھ جائے گا۔ یہ لوگ ایسے اسرار بیان کر کے اسلام کے ساتھ دوستی نہیں کرتے بلکہ دشمنی کرتے ہیں اور یہ حائے اسلام نہیں بلکہ اسلام کے ناوان دوست ہیں۔ ع

”دوستی بے خرد چوں دشمنی ست“

اب میں آپ کو بتلاتا ہوں کہ اس تقریر میں زہر کیا ہے۔ اس میں مضمون کا حاصل یہ ہے کہ اس اصل چیز تو اتفاق ہے اور جماعت پنجگانہ اور جموعہ دین دین دج اسی اتفاق کے پیدا کرنے کے واسطے ذرائع و وسائل ہیں۔ تو عجب نہیں کہ بعض لوگوں پر اس کا یہ اثر ہو کہ وہ ان احکام کو مقصود بالذات نہ سمجھیں اور اگر کبھی کسی دوسرے طریق سے اتفاق ممکن ہوا تو وہ سب آسان سے جماعت اور نماز دونوں کے چھوڑنے پر آمادہ ہو جائیں گے۔ کیونکہ ان کے خیال میں تو یہ سب احکام حصول اتفاق کیلئے مقرر ہوئے ہیں۔ اور انکو کلاب جانے اور تھیر میں مل کر شریک ہونے سے بھی یہ بات حاصل ہو سکتی جہاں راحت ہے آرام کسی اور گدے تیگوں پر جگہ ملتی ہے تودہ خواہ مخواہ

مسجد میں کیوں آنے لگے اور وضو اور نماز کی مشقت کیوں برداشت کرنے لگے۔

وضو کا انکار چنانچہ اس وقت ان تقریروں کا یہ ضرر نمایاں ہو رہا ہے اخباروں میں ایک شخص کا قول شائع ہوا تھا کہ وضو کی ضرورت ابتدائے اسلام میں تھی آج کل نہیں ہے کیونکہ اس وقت بددی لوگ پاک صاف نہ رہتے تھے۔ جنگل کے کاروبار سے غبار آلودہ آتے تھے اسلئے ان کو وضو کا حکم کیا گیا۔ اور ہم لوگ آج کل ہم لوگ صفائی کا بہت اہتمام رکھتے ہیں ہر وقت موزے اور دستانے چڑھائے رہتے ہیں جن کی وجہ سے ہاتھ بیکر گر دے محفوظ رہتے ہیں ہم کو وضو کی ضرورت نہیں۔

یہ نتیجہ ہے ایسے اسرائیلیان کرنے کا کہ اب ہر شخص اس قسم کی مصلحتوں ہی کو مقصود سمجھنے لگا اور اس شخص سے کچھ بھی تعجب نہیں کہ وہ نماز کو بھی چھوڑ دے اور یہ کہے کہ نماز کی ضرورت ابتدائے اسلام میں اسلئے تھی کہ اس زمانے کے لوگ جاہلیت کی وجہ سے بڑے متکبر و مکرش ہوتے تھے اور ان کو مہذب بنانے کے لئے یہ افعال تواضع و خشوع کے تعلیم فرمائے گئے تھے۔ اور ہم لوگ تعلیم یافتہ ہیں ہمارے اندر تعلیم سے تہذیب پیدا ہو گئی ہے ہم کو نماز کی کیا ضرورت ہے۔

قربانی پر اعتراض اسی طرح قربانی کے متعلق ایک شخص نے جو کہ مسلمان ہیں منکشتان سے مجھ کو لکھا تھا کہ قربانی شریعت کو مقصود نہیں اور یہ بالکل خلاف عقل ہے کہ ایک دن میں اتنے جانوروں کو ذبح کیا جاوے جن کا گوشت آدمیوں سے کھایا بھی نہ جائے۔ چنانچہ اس لئے منیٰ میں قربانی کرتے ہی جانوروں کو کھیتوں میں ڈال دیا جاتا ہے۔ غضب یہ ہے کہ آج کل خدا پر بھی عقل کی حکومت ہوئے لگی۔ خدا فسوس ہے۔

لے ان حضرات نے منیٰ میں کھیتوں کے اندر جانوروں کے دبانے کی جو یہ وجہ بتلائی کہ اتنا گوشت آدمیوں سے کھایا نہیں جاتا یہ بالکل غلط ہے کیونکہ موسم حج پر جتنے آدمی جمع ہوتے ہیں سب کے سب مالدار نہیں ہوتے اور نہ سب قربانی کرتے ہیں بلکہ حجاج میں زیادہ تر غریب ہوتے ہیں۔ ہم دعویٰ سے کہتے ہیں کہ اگر منیٰ کے قربانی کا سارا گوشت حجاج میں اور بدویوں میں تقسیم کر دیا جائے تو وہ ہرگز سب کو کافی نہ ہوگا بلکہ بہت لوگ پھر بھی مجرم رہ جائیں بلکہ منیٰ میں قربانی کے جانوروں کو محض ڈاکٹروں کی رائے سے دبا جاتا ہے۔

بس اس خلاف عقل حرکت کے جواب وہ ڈاکٹر ہیں جن کی رائے سے ایسا کیا جاتا ہے۔

قانون عقل حاکم ہے

میں کہتا ہوں کہ ایک جگہ اگر کسی مجرم کو سزا دے اور مجرم یہ کہے کہ یہ سزا تو عقل کے خلاف ہے تو کیا وہ اس بات کی سماعت کرے گا۔ ہرگز نہیں۔ بلکہ وہ صاف یہ کہے گا کہ قانون پر تمہاری عقل کی حکومت نہیں بلکہ قانون عقل پر حاکم ہے۔ اور اس کے اس جواب کو سب عقلاء تسلیم کرتے ہیں۔ مگر حجت یہ ہے کہ قانون الہی کو آج کل کے مسلمان اپنی عقل پر حاکم نہیں مانتے بلکہ اس کو اپنی عقل کے تابع کرنا چاہتے ہیں اور یہ جواب علی سبیل التمثیل ہے۔ ورنہ قانون الہی تو بالکل عقل کے مطابق ہے بشرطیکہ عقل سلیم ہو۔ یہ کیا ضرور ہے کہ ہر شخص کی عقل میں اس کی حکمتیں آجایا کریں۔ آخر پارلیمنٹ کے عقلاء جو قوانین تجویز کرتے ہیں کیا ہر عامی کی عقل اس کے مصالح تک پہنچ جاتی ہے؟ ہرگز نہیں! بلکہ اس کے مصالح و حکم کو خاص خاص حکام ہی سمجھتے ہیں۔ پھر قانون الہی کی حکمتوں اور مصالح کو ہر شخص اپنی عقل سے کیوں معلوم کرنا چاہتا ہے۔ اور یہاں یہ کیوں نہیں کہا جاتا کہ قانون الہی عقل کے مطابق ضرور ہے مگر ہماری عقلیں اس کے مصالح سمجھنے سے قاصر ہیں۔ خاص خاص لوگ ہی اس کو سمجھ سکتے ہیں اور بالفرض اگر کسی قانون کی حکمت خاص لوگوں کی عقل میں بھی نہ آئے تو قانون کے بدلنے کا کسی کو اختیار نہیں کیونکہ قانون پر عقل حاکم نہیں بلکہ اس کی ماتحت اور اس کی تابع ہے۔

قربانی کا مقصد

غرض ان حضرات نے مجھے لکھا کہ قربانی خود شریعت کو مقصود نہیں بلکہ اصل مقصود غریبار کی امداد ہے اور ابتدائے اسلام میں لوگوں کے پاس نقد کم تھا۔ مولیشی زیادہ تھے۔ اسلئے یہ طریقہ اختیار کیا گیا کہ جانور ذبح کر کے غریبار کو گوشت دیدو۔ اور اس زمانہ میں نقد بھی بہت موجود ہے۔ غلہ بھی موجود ہے۔ پس آج کل بجائے قربانی کرنے کے نقد روپے سے غریبار کی امداد کرنا چاہئے۔ تو اس شخص نے قربانی کی حکمت امداد غریبار سمجھ کر جب یہ دیکھا کہ یہ حکمت دوسرے طریقہ سے بھی آسانی حاصل ہو سکتی ہے۔ قربانی چھوڑنے کا ارادہ کر لیا حالانکہ یہ حکمت مقصود ہی نہیں بلکہ مقصود تو تعمیل حکم ہے۔ اگر یہ حکمت مقصود نہ ہوتی تو اس کی کیا وجہ کہ غریبار کو زندہ جانور دینے سے واجب ادا نہیں ہوتا۔ اگر اس زمانے میں نقد اور غلہ کم تھا اور مولیشی زیادہ تھے۔ اسلئے جانوروں کے ذریعہ غریبار کی امداد کا طریقہ مقرر ہوا تھا۔ تو اس کے منیٰ کہ جانور کو ذبح کر کے غریبار کو گوشت ہی دیا جائے تو واجب ادا ہو اور زندہ جانور کسی غریب کو دیدیں تو واجب ادا نہ ہو۔

پھر کیا پہلے مسلمانوں پر نقد کی وسعت کبھی نہ ہوئی تھی؟ بالکل غلط ہے۔ تاریخ اٹھا کر دیکھو تو معلوم ہو کہ صحابہ نے جس وقت کسریٰ و قیصر کے خزانے فتح کئے ہیں تو مسلمانوں کے پاس نقد سونا اور چاندی اس قدر تھا کہ آج کل تو اس کا عشر عشر بھی نہ ہوگا۔ پھر اس وقت صحابہ رضی اللہ عنہم کو یہ بات کیوں نہ سوجھی جو اس شخص کو انگلستان میں بیٹھکر سوجھی اور صحابہ نے بجائے قربانی کے نقد امداد کو کیوں نہ اختیار کیا۔

دوسرے اگر یہ حکمت قربانی سے مقصود بالذات ہوتی تو اس کا مقصد یہ تھا کہ قربانی کے گوشت میں سے کسی حصہ کا تصدق ضرور واجب ہوتا حالانکہ شریعت میں یہ بھی حکم نہیں بلکہ اگر کوئی شخص سارا گوشت خود ہی کھالے اور غریب کو کھوجہ برابر بھی نہ دے تو قربانی میں کچھ قصور نہیں آتا۔ اس سے صاف معلوم ہوتا ہے کہ امداد غریبہ قربانی سے مقصود بالذات نہیں بلکہ مقصود کچھ اور ہے۔ مگر آپ نے دیکھ لیا کہ اس قسم کے اسرار بیان کرنے کا نتیجہ کہاں تک پہنچا ہے کہ ہر شخص اپنی مختصر حکمتوں پر احکام سمجھنے لگا۔ (رسائل النجاشی ص ۱۵)

۱۰) کعبہ کا بعض بزرگوں کے استقبال کیلئے جائیکی تحقیق، اور اس پر شبہات کا جواب

بعض بزرگوں کی نسبت یہ مشہور ہے کہ وہ مکہ معظمہ پہنچے تو جا کر دیکھا کہ کعبہ نہیں ہے سخت حیرت ہوئی اور باری تعالیٰ سے دعا کی کہ مجھے معلوم ہو جائے کہ اس وقت کعبہ کہاں ہے چنانچہ ارشاد ہوا کہ ہم منکشف کئے دیتے ہیں۔ دیکھا تو معلوم ہوا کہ ایک بزرگ آ رہے ہیں۔ کعبہ ان کے استقبال کو گیا ہوا تھا۔

اور یہ حکایت تین فرقوں کو مضر ہوئی ایک تو ان کو جنہیں دین سے کچھ بھی تعلق اور واسطہ نہیں۔ ایسے لوگوں نے تو اس کی تکذیب کی۔ اور کہنے والوں پر ہنسنا اور دہم پرست کہنا شروع کیا۔ دوسرے ان دینداروں کو جو کہ محض ظاہر پرست ہیں۔ ایسے لوگوں نے انکو صوفیہ کے دھوکے کہہ کر اڑا دیا۔ تیسرے ان لوگوں کو جو فلسفی دماغ کے ہیں اور تاریخ ان کا نصب العین ہے۔ انھوں نے

اس کو خلاف عقل بتلایا۔ اور یہ اعتراض اس پر کیا کہ اگر ایسا ہوتا تو تاریخوں میں اس کا تذکرہ ضرور ہوتا۔ سو ہم نے کسی تاریخ میں نہیں دیکھا۔ حالانکہ ان تینوں کی حالت یہ ہے۔ ح۔
” بچوں نہ دیدند حقیقت رہ افسانہ زدند “

تو سمجھو کہ ایک کعبہ کی صورت ہے اور ایک کعبہ کی روح ہے۔ روح کعبہ ایک خاص تجلی ہے کہ کعبہ ظاہری اس کا منظر ہے۔ پس جن بزرگوں نے یہ دیکھا کہ کعبہ اپنی جگہ نہیں ہے اس کے معنی یہ ہیں کہ وہ روح کعبہ زائرین کی طرف متوجہ نہیں ہے بلکہ ان بزرگ کی طرف متوجہ ہے۔ غرض بعض بزرگ ایسے بھی ہوئے ہیں کہ جن کی طرف کعبہ نے خود توجہ کی۔ لیکن حج کیلئے انکو بھی خود کعبہ ہی میں آنا پڑا۔ (اصلاح النفس ص ۱۲)

۱۱) جدید تعلیم یافتہ طبقہ کی اس غلطی کا جواب کہ اسلام میں سلطنت جمہوری کی تعلیم ہے

نظام عالم تابعیت و منبوعیت کو چاہتا ہے اس لئے متبوع کو تابع کی مساوات گوارا نہیں اسی وجہ سے سلطنت کی ضرورت ہے تاکہ ایک تابع ہو ایک متبوع ہو۔ سب کے سب آزادانہ ہوں بلکہ متبوع کے سامنے تابع کی آزادی سلب ہو جائے۔ یہ حقیقت ہے سلطنت کی۔ اگر سلطنت نہ ہو تو ہر شخص آزاد ہوگا اور آزادی مطلق انتظام کے لئے ہرگز کافی نہیں۔ اور نہ کسی نے آج تک اسکو گوارا کیا۔ بعض لوگ کہتے ہیں کہ سلطنت کوئی چیز نہیں۔ چنانچہ آج کل ایک فرقہ نکلا ہے جو سلطنت کا مخالف ہے مگر میں نہیں سمجھتا کہ بدوں سلطنت کے انتظام نزاعات کا فیصلہ کیونکر ہوگا۔ اگر کہو کہ کثرت رائے سے فیصلہ ہوگا تو میں کہتا ہوں کہ جن کثیرین کی رائے پر فیصلہ ہوگا وہی سلطنت کے مصلحت ہو گئے۔ کیونکہ ان کے سامنے دوسروں کی آزادی سلب ہو گئی۔ اور یہی حقیقت ہے سلطنت کی کہ بعض کی آزادی بعض کی رائے کے سامنے سلب ہو جائے۔ کثرت رائے پر فیصلہ ہونے کے بعد بھی آزادی مطلق کہاں رہی۔ اس فیصلہ کی پابندی سے بھی تو آزادی سلب ہوگی۔ تو یہ لوگ جس چیز کو مٹاتے ہیں اخیر میں اس کو ثابت کرتے ہیں۔ خدائے تعالیٰ نے بھی آزادی مطلق کو گوارا نہیں کیا بلکہ

ایک کو تابع ایک کو متبوع بنایا ہے۔ چنانچہ حق تعالیٰ نے اپنے احکام نبی کے واسطے سے بھیجے ہیں اور تمام مخلوق پر نبی کا اتباع فرض کیا ہے تاکہ مخلوق کو کسی ایک کا تابع کیا جائے۔ ورنہ بہت سہل تھا کہ انبیاء علیہم السلام کو نہ بھیجتے بلکہ آسمان سے چھپے ہوئے کاغذ ہر ایک کے پاس آکر گرتے اور ہر شخص اس کو پڑھ کر کام کرتا نہ نبی کا اتباع ضروری ہوتا، نہ خلیفہ کا نہ علماء کا نہ مجتہدین کا۔

خدا کے یہاں پریس کہاں ہے | شاید کوئی کہے کہ خدا تعالیٰ کے یہاں پریس کہاں ہے۔ میں

کہتا ہوں کہ جب ہم نے پریس ایجاد کر لئے ہیں تو خدا تعالیٰ کو پریس بنالینا کیا مشکل ہے۔ بلکہ تم جو کچھ ایجاد کرتے ہو یہ عقل سے ایجاد کرتے ہو، اور عقل خدا کی دی ہوئی ہے تو یہ ایجاد بھی حقیقت میں خدا تعالیٰ کی ایجاد ہے۔ تمہارا تو محض نام ہی نام ہے۔ اس لئے یہ شبہ محض لغو ہے۔

دوسرے میں دعویٰ کرتا ہوں کہ حق تعالیٰ کے یہاں اس وقت بھی پریس موجود ہیں۔ کیونکہ کاتبین اعمال کا لکھا ہوا قیامت تک نہ مٹے گا۔ ایسی سیاہی اور ایسا کاغذ تو کسی پریس کو نصیب نہیں جو قیامت تک باقی رہے تو پھر کاتبین اعمال آپ کے کاموں کو ایسی سیاہی سے روزانہ لکھتے ہیں وہی اگر احکام کو لکھ کر ہر شخص کے پاس طوالت دیا کریں تو کیا مشکل ہے۔ مگر حق تعالیٰ نے ایسا نہیں کیا بلکہ حکام کو نبی پر نازل کیا اور مخلوق کو نبی کا تابع کیا تاکہ آزادی سلب ہو جائے۔

جو لوگ جمہوری سلطنت کے حامی ہیں اور حریت و مساوات کے مدعی ہیں وہ بھی آزادی کا ہونا گوارا نہیں کرتے۔ کیونکہ

جمہوری سلطنت کے بعد بھی وہ کوئی قانون ہوگا جس کی پابندی عام رعایا پر لازم ہوگی تو اس قانون کے سامنے سب کی آزادی سلب ہو جائے گی ہم تو آزادی کا دعویٰ جب مانیں جب کسی شخص کو بھی قانون کا پابند نہ کیا جائے بلکہ جس کے جوجی میں آئے کرنے دیا جائے کسی سے کچھ مزاحمت نہ کیجاوے کیونکہ تم تو آزادی کے حامی ہو۔ تو آزادی تو اسی کا نام ہے کہ کوئی کسی بات کا پابند نہ ہو۔

پھر تو لوگوں کو قانون کا پابند کیوں بناتے ہو اور ان کی آزادی کو قانون کا تابع کیوں بناتے ہو۔ کم از کم یہی کہ وہ قانون بنانے میں ساری رعایا کی رائے لے لیا کرو۔ قانون سازی کے لئے پارلیمنٹ کی مختصر جماعت کو کیوں خاص کر رکھا ہے۔ اور تمام رعایا کو چند آدمیوں کی رائے کا

تابع کیوں بنا رکھا ہے۔

حقیقت یہ ہے کہ جو لوگ جمہوری سلطنت کے حامی ہیں وہ بھی شخصیت ہی کے حامی ہیں مگر شخص کبھی حقیقی ہوتا ہے کبھی حکمی۔ فلسفہ کا مسئلہ یہ ہے کہ مجموعہ بھی شخص واحد ہے مگر وہ واحد حکمی ہے حقیقی نہیں۔ تو یہ لوگ جس پارلیمنٹ کے فیصلوں کا اتباع کرتے ہیں اس میں گونبظا ہر بہت سے آدمی ہوتے ہیں مگر مجموعہ عمل کر پھر شخص واحد ہے کیونکہ جو قانون پاس ہوتا ہے وہ سب کی رائے سے مل کر پاس ہوتا ہے۔

پارلیمنٹ میں بھی ہر شخص آزاد نہیں کہ جو رائے دیدے وہی پاس ہو جایا کرے۔ اگر ایسا بھی ہوتا جب بھی کسی قدر آزادی کا دعویٰ اٹھتا ہو تا مگر وہاں تو پارلیمنٹ کے بھی ہر شخص کی انفرادی رائے معتبر نہیں بلکہ انجائی رائے معتبر ہے اور اجتماعی رائے پھر شخصی رائے ہے کیونکہ مجموعہ عمل کر واحد حکمی ہو جاتا ہے۔

خلاصہ یہ ہوا کہ ہم شخص واحد حقیقی کے حامی ہیں اور ہم شخص واحد حکمی کے حامی ہو۔ جمہوریت کے حامی تو تم بھی نہ رہے۔ جمہوریت اور آزادی کامل تو جب ہوتی جب ہر شخص اپنے فعل میں آزاد ہوتا کوئی کسی کا تابع نہ ہوتا۔ نہ ایک بادشاہ کا، نہ پارلیمنٹ کے دس ممبروں کا۔ اور یہ کیا آزادی ہے کہ تم نے لاکھوں کروڑوں آدمیوں کو پارلیمنٹ کے دس ممبروں کی رائے کا تابع بنادیا۔ ہم تو ایک ہی کا غلام بناتے تھے تو نے دس کا غلام بنادیا۔ تمہیں فیصلہ کر لو کہ ایک کا غلام ہونا اچھا ہے یا دس بیگل کا غلام ہونا۔ ظاہر ہے کہ جس شخص پر ایک کی حکومت ہو اس سے بہتر ہے جس پر دس بیگل کی حکومت ہو۔ یہ حاصل ہے جمہوری سلطنت کا کہ رعایا کی غلامی سے تو اس کو بھی انکار نہیں مگر وہ یہ کہتی ہے کہ تم دس بیگل کی غلامی کرو۔ اور ہم یہ کہتے ہیں کہ صرف ایک کی غلامی کرو۔

شریعت میں یہ خاص بات ہے کہ اس کے دعاوی کہیں نہیں ٹوٹتے۔ شریعت نے آزادی کا ایسے زور سے دعویٰ ہی نہیں کیا جو اس پر نقص وارد ہو اور جو لوگ آزادی کا دم بھرتے ہیں کسی وقت ان کو اپنے دعویٰ سے ہٹنا پڑتا ہے۔ آخر کیوں ہٹتے ہو؟ اگر کوئی شخص پارلیمنٹ کے فیصلہ کو نہ مانے تو اس کو مجبور کیوں کرتے ہو۔ اسے پارلیمنٹ کا غلام کیوں بناتے ہو۔ آزادیوں نہیں رہتے دیتے مگر کیونکہ آزادی دہنے دیں۔ نظام عالم بدوں اس کے قائم نہیں ہو سکتا کہ مخلوق میں بعض تابع ہوں بعض متبوع ہوں آزادی مطلق سے فساد برپا ہوتے ہیں۔ اس لئے یہاں اگر ان کو اپنے دعویٰ آزادی سے ہٹنا پڑتا ہے۔ اور شریعت کو کبھی اپنے دعویٰ سے ہٹنا نہیں پڑتا۔ کیونکہ وہ تو پہلے ہی

تابیعت و متبوعیت کی حامی ہے وہ تو آزادی کا سبق سکھاتی ہی نہیں اول ہی دن سے نبی کے اتباع کا حکم دیتی ہے جس سے تمام مخلوق کو ایک کا تابع کر دیا۔ بلکہ اگر کسی وقت خدا تعالیٰ نے ایک زمانے میں دو نبی بھی ایک قوم کی طرف ارسال کئے ہیں تو ان میں بھی ایک تابع تھے۔ دوسرے متبوع تھے۔

ایک زمانہ میں دہلی

ایک زمانہ میں دہلی چنانچہ حضرت موسیٰ ہارون علیہما السلام ایک زمانہ میں دہلی تھے جو نبی اسرائیل و قوم قبطہ کی طرف مبعوث ہوئے تھے مگر ان میں حضرت موسیٰ علیہ السلام متبوع تھے، حضرت ہارون علیہ السلام تابع تھے، دونوں برابر درجہ میں تھے اور یہ تابعیت محض ضابطہ کی تابعیت نہ تھی بلکہ واقعی تابعیت تھی کہ حضرت موسیٰ علیہ السلام ہارون علیہ السلام پر پوری حکومت رکھتے تھے وہ ان کی مخالفت نہ کر سکتے تھے۔ چنانچہ حق تعالیٰ نے ایک واقعہ ایسا پیدا کر دیا جس سے اس حقیقت کا ظہور ہو گیا۔

جب موسیٰ علیہ السلام تو رات لیٹنے کے لئے کوفہ طور پر تشریف لے گئے تو ہارن علیہ السلام کو اپنا خلیفہ بنا کر چھوڑ گئے تھے کہ میرے پیچھے بنی اسرائیل کا خیال رکھنا اور انکی اصلاح کرتے رہنا۔

قصہ سامری

قصہ سامری یہاں پیچھے یہ قصہ ہوگا سامری نے ایک سونے کا بچھڑا بنایا اور اس میں قدم جبرئیل علیہ السلام کی مٹی ڈال دی جس سے اس میں حیات پیدا ہوگئی

فَقَاتُوا هَذَا إِلَهُكُمْ وَإِلَهُ مُوسَىٰ فَتَنِي، جاہل لوگ کہنے لگے کہ ہمارا اور موسیٰ علیہ السلام کا خدا تو ہے وہ بھول کر نہ معلوم کہاں چلے گئے۔ بس بیوقوف لگے اس کی عبادت کرنے۔ موسیٰ علیہ السلام کو حق تعالیٰ نے اس واقعہ کی اطلاع دی وہ غصہ میں بھرے ہوئے تشریف لائے۔ اور قوم کی حالت دیکھ کر انوس ہوا۔ اسی وقت انھوں نے ہارون علیہ السلام سے فرمایا کہ جب تک بخت گمراہ ہو گئے تھے تو تم یہاں کیوں رہے میرے پاس باقی ماندہ جماعت لو لے کر کیوں نہ چلے آئے اور غصہ میں ان کا سردار ڈاڑھی کیڑ کر کھینچنے لگے قَالَ يَا إِبْنُؤُمَّ لَا تَأْخُذْ بِلِحْيَتِي وَلَا بِرَأْسِي ہارون علیہ السلام نے کہاے بھائی میری ڈاڑھی اور سر نہ پکڑو۔ میری بات سنو بوجھے یہ اندیشہ ہوگا اگر میں انکو چھوڑ کر چل دوں گا تو آپ یہ نہ کہیں کہ تو نے وہاں رہ کر انکو سمجھایا کیوں نہیں انکی اصلاح کیوں نہ کی اسلئے میں یہیں رہ کر ان کو سمجھاتا رہا حالانکہ ہارون علیہ السلام عمر میں موسیٰ علیہ السلام سے بڑے تھے مگر نبوت میں ان کے تابع تھے اسلئے موسیٰ نے بے تکلف اپنی مقبوعیت اور ان کی تابعتیت کے مقتضی پر عمل کیا اور وہ برتاؤ جو حاکم حکوم کے ساتھ کرتا ہے۔ سچ ایک سب انسپکٹر باجوہ کی

انسپیٹر کا تاج اور ماتحت ہوتا ہے۔ مگر انسپیٹر اپنے ماتحت کے ساتھ ایسا کر کے تو دیکھیں۔
تاج اور متبوع | معلوم ہوا کہ ہارون علیہ السلام کی تابعیت محض ضابطہ کی نہ تھی بلکہ واقعی تابعیت تھی، جس کا اس واقعہ سے ظہور ہو گیا۔ اور لوگوں کو معلوم ہو گیا کہ دونوں رسولوں میں ایک تاج ہیں ایک متبوع ہیں اور دونوں یکساں مرتبے میں نہیں ہیں۔

اس واقعہ سے بعض لوگوں کو تعجب ہوتا ہو گا کہ موسیٰ علیہ السلام کے اس فعل میں کیا حکمت تھی۔ لیکن ایک حکمت تو میرے قلب پر اسی وقت آگئی کہ حق تعالیٰ کو مبنیہیت اور تالیفیت کا ظاہر کرنا تھا اسلئے موسیٰ علیہ السلام کو غصہ سے ایسا بیتاب کر دیا جس سے انھوں نے اپنی حکومت مبنیہیت کے مقصدی پر بے تکلف عمل کیا اور نہ معلوم کتنی حکمتیں ہوں گی۔

تخصی حکومت

شخصی حکومت

غرض اسلام میں جمہوری سلطنت کوئی چیز نہیں۔ اسلام میں محض شخصی حکومت کی تعلیم ہے اور جن مفاسد کی وجہ سے جمہوری سلطنت قائم کی گئی ہے وہ سلطنت شخصی میں لوجھلک ہی ہیں اور جمہوری میں متیقن ہیں۔ شخصی سلطنت میں خرابیاں بیان کی جاتی ہیں کہ اس میں ایک شخص کی رائے پر سارا انتظام چھوڑ دیا جاتا ہے کہ وہ جو چاہے۔ حالانکہ ممکن ہے کہ کسی وقت اس کی رائے غلط ہو۔ اس لئے ایک شخص کی رائے پر سارا انتظام چھوڑنا چاہئے بلکہ ایک جماعت کی رائے سے کام ہونا چاہئے۔ میں کہتا ہوں کہ جس طرح شخصی سلطنت کے بادشاہ کی رائے میں کبھی غلطی کا احتمال ہے اسی طرح جماعت کی رائے میں بھی غلطی کا احتمال کیونکہ یہ ضرور نہیں کہ ایک شخص کی رائے ہمیشہ غلط ہو کرے۔ اور دوس کی رائے ہمیشہ صحیح ہو کرے۔ ایسا بھی بکثرت ہوتا ہے کہ بعض دفعہ ایک شخص کا ذہن وہاں پہنچتا ہے جہاں ہزاروں آدمیوں کا ذہن نہیں پہنچتا۔ ایجادات عالم میں رات دن اس کا مشاہدہ ہوتا ہے کیونکہ جتنی ایجادات ہیں ان میں سے ایک شخص کی عقل کا نتیجہ ہیں کسی نے کچھ سمجھا کسی نے کچھ سمجھا۔ ایک نے تاریکی کو ایجاد کیا۔ ایک نے آگ کو ایجاد کیا۔ تو موجود اکثر ایک شخص ہوتا ہے اور اس کا ذہن وہاں پہنچتا ہے۔ جہاں صد ہا ہزار آدمی کا ذہن نہیں پہنچتا۔ علوم میں بھی یہ امر مشاہدہ ہے کہ بعض دفعہ ایک شخص کسی مضمون کو اس طرح بیان کرتا ہے کہ تمام تشریح و تفسیر کی تقریریں اس کے سامنے غلط ہو جاتی ہیں۔ تو جماعت کی رائے کا ہونا بھی محتمل ہے۔ اب بتلائے اگر کسی وقت بادشاہ کی رائے صحیح ہوئی اور پارلیمنٹ کی رائے غلط ہو تو عمل کس پر ہوگا۔ جمہوری سلطنت میں کثرت رائے پر فیصلہ ہوتا ہے تو بادشاہ اپنی رائے پر

عمل نہیں کر سکتا بلکہ یہ کثرت رائے سے مغلوب ہو کر غلط رائے کی موافقت پر مجبور ہوتا ہے اور شخصی سلطنت میں بادشاہ اپنی رائے پر ہر وقت عمل کر سکتا ہے۔ اور جمہوری میں اگر کثرت رائے غلطی پر ہوئی تو صحیح رائے پر عمل کرنے کی کوئی صورت نہیں سب مجبور ہیں غلط رائے کی موافقت پر۔ اور یہ کتنا بڑا ظلم ہے۔ اس لئے یہ قاعدہ ہی غلط ہے کہ کثرت رائے پر فیصلہ کیا جائے۔ بلکہ قاعدہ یہ ہونا چاہئے کہ صحیح رائے پر عمل کیا جاوے خواہ وہ ایک ہی شخص کی رائے ہو

مولانا محمد حسین صاحب الہ آبادی
سرسید اور مولانا محمد حسین میں مکالمہ
جو کثرت رائے پر فیصلہ کرتے ہیں اس کا حاصل یہ ہے کہ حماقت کی رائے پر فیصلہ کرتے ہو کیونکہ قانون فطرت یہ ہے کہ دنیا میں عقلا کم ہیں اور بیوقوف زیادہ۔ تو اس قاعدہ کی بنا پر کثرت رائے کا فیصلہ بیوقوفی کا فیصلہ ہوگا۔ سید احمد خاں نے جواب دیا کہ دنیا میں جو عقلا کی قلت اور بیوقوفوں کی کثرت ہے یہ اس صورت میں ہے جب کہ بہت سے آدمیوں کو کیفیت مالتق جمع کر لیا جاوے تو ان میں واقعی بیوقوف زیادہ ہوں گے لیکن جن لوگوں کی کثرت رائے پر فیصلہ کرتے ہیں وہ کیفیت مالتق جمع نہیں کئے جاتے بلکہ انتخاب کر کے خاص خاص آدمیوں کی کمیٹی بنائی جاتی ہے جس میں سب عقلا رہی ہوتے ہیں تو ان میں جس طرف کثرت ہوگی وہ بیوقوف کی کثرت نہ ہوگی بلکہ عقلا کی کثرت ہوگی مولانا نے جواب دیا کہ بہت اچھا۔ لیکن عقلا میں بھی قانون فطرت یہ ہے کہ کامل عقل تھوڑے ہیں اور ناقص العقل زیادہ۔ چنانچہ تجربہ کر لیا جائے کہ ہزار عقلوں میں کامل العقل ایک دو ہی ہوتے ہیں تو عقلا میں بھی کثرت انہیں لوگوں کی سپہ ہونا ناقص العقل ہیں۔ پس کثرت رائے پر فیصلہ اگر حماقت کا فیصلہ نہیں تو کم عقلی کا فیصلہ تو ضرور ہی ہوگا۔ سید احمد خاں کے پاس اس کا کوئی جواب نہ تھا۔ بالکل خاموش ہی ہو گئے

کثرت رائے
غرض صحیح رائے پر عمل کرنا بدون شخصی حکومت کے ممکن نہیں جمہوری میں تو کثرت رائے کا اتباع لازم ہے خواہ وہ غلط ہو یا صحیح ہو بلکہ مولانا محمد حسین صاحب کے موافق کثرت رائے اکثر غلط ہی ہوگی تو گویا جمہوری میں اکثر غلط رائے پر عمل ہوتا ہے اور اور ظاہر ہے کہ جب تک صحیح رائے پر عمل نہ ہوگا اس وقت تک انتظام درست نہیں ہو سکتا۔ پس ثابت ہو گیا کہ انتظام بدون شخصی حکومت کے نہیں ہو سکتا۔ دوسرے جو لوگ کثرت رائے پر فیصلہ کا مدار رکھتے ہیں۔ وہ بادشاہ کو تنہا فیصلہ کرنے کا اختیار نہیں دیتے۔ وہ پہلے ہی سے اس کو تسلیم

کرتے ہیں۔ کہ ہمارا بادشاہ ایسا ضعیف الرائے ہے کہ اس کی تنہا رائے قابل اعتبار نہیں اور وہ نااہل ہے۔ تو واقعی جو لوگ اپنے بادشاہ کو ایسا سمجھتے ہیں ہم ان سے گفتگو نہیں کرتے انکو جمہوریت مبارک ہو۔ ایسا نااہل بادشاہ ہرگز اس قابل نہیں کہ اس کو شخصی سلطنت کا بادشاہ بنالیا جائے۔ اسلام میں جو شخصی سلطنت کی تعلیم ہے تو اس کے ساتھ یہ بھی حکم ہے کہ اے اہل حل و عقد اور اے جماعت عقلا بادشاہ ایسے شخص کو بناؤ جو اتنا صاحب الرائے ہو کہ اگر کبھی اس کی رائے سارے عالم کے بھی خلاف ہو تو یہ احتمال ہو سکے کہ شاید اسی کی رائے صحیح ہو۔ اور جس کی رائے میں اتنی زراعت نہ ہو اسکو ہرگز بادشاہ نہ بناؤ۔ اب بتلاؤ کہ جس کی رائے اتنی زریں ہو کہ سارے عالم کے مقابلہ میں بھی اس کی رائے کے صاحب ہونے کا احتمال ہو وہ حکومت شخصی کے قابل ہے یا نہیں؟ یقیناً قابل ہے بشرطیکہ اہل حل و عقد انتخاب میں خیانت نہ کریں۔

شخصی سلطنت
بس ہم شخصی سلطنت کے اس لئے حامی ہیں کہ ہم بادشاہ کو زمین العقل صاحب الرائے سمجھتے ہیں اور تم کثرت رائے کے اس لئے حامی ہو کہ تم اپنے بادشاہ کو ضعیف الرائے اور نااہل سمجھتے ہو۔ تو ایسے شخص کو بادشاہ بنانے کی ضرورت ہی کیا ہے جس کے لئے غم غم کی ضرورت ہو بلکہ پہلے ہی سے بادشاہ ایسے شخص کو بناؤ جو غم غم کا محتاج نہ ہو مستقل الرائے ہو۔ اور اگر تم بھی اپنے بادشاہ کو مستقل الرائے صاحب العقل زریں سمجھتے ہو تو پھر کثرت رائے پر فیصلہ کا مدار رکھنا اور کامل کو ناقصین کی رائے کا تابع بنانا ظلم ہے جس کا حماقت ہونا بدیہی ہے۔

بعض لوگوں کو یہ حماقت سوچتی ہے کہ وہ جمہوری سلطنت کو اسلام میں ٹھوننا چاہتے ہیں اور اور دعویٰ کرتے ہیں کہ اسلام میں جمہوریت ہی کی تعلیم ہے اور استدلال میں یہ آیت پیش کرتے ہیں کہ وَشَاوْهُمْ فِي السُّبْحِ مِمْرٌ مِمْرٌ یہ بالکل غلط ہے۔ ان لوگوں نے مشورہ کی دفعات ہی کو دفع کر دیا اور اسلام میں مشورہ کا جو درجہ ہے اس کو بالکل نہیں سمجھا۔

حضرت بربرہ کا واقعہ
اسلام میں مشورہ کا درجہ یہ ہے کہ ایک مرتبہ حضور صلی اللہ علیہ وسلم نے حضرت بربرہ رضی اللہ عنہا سے فرمایا تھا کہ اے بربرہ تم اپنے شوہر سے رجوع کرلو۔ قصہ یہ ہوا کہ حضرت بربرہ رضی اللہ عنہا پہلے باندی تھیں اور

اور اسی حالت میں ان کا نکاح ایک شخص سے جن کا نام مغیث تھا ان کے آقا نے کر دیا تھا۔ جب وہ آزاد ہوئیں تو قانون اسلام کے مطابق ان کو یہ اختیار دیا گیا کہ جو نکاح حالت غلامی میں ہوا تھا اگر چاہیں اس کو باقی رکھیں اگر چاہیں فسخ کر دیں۔ اصطلاح شریعت میں اس کو اختیار عتق کہتے ہیں اس اختیار کی بنا پر حضرت بریرہ رضی اللہ عنہ نے نکاح سابق کو فسخ کر دیا لیکن ان کے شوہر کو ان سے محبت تھی۔ وہ صدمہ فراق میں مدینہ کی گلی کوچوں میں روتے پھرتے تھے۔ حضور صلی اللہ علیہ وسلم کو اس پر رحم آیا اور حضرت بریرہ رضی اللہ عنہا سے آپ نے فرمایا کہ اے بریرہ کیا اچھا ہو اگر تم اپنے شوہر سے رجوع کر لو۔ تو وہ دریافت فرماتی ہیں کہ یا رسول اللہ یہ آپ کا حکم ہے یا مشورہ کی ایک فرد ہے۔ اگر حکم ہے تو بسر و چشم منظور ہے گو مجھ کو تکلیف ہی ہو آپ نے فرمایا حکم نہیں صرف مشورہ ہے۔ تو حضرت بریرہ رضی اللہ عنہا نے صاف عرض کر دیا کہ اگر مشورہ ہے تو میں اس کو قبول نہیں کرتی۔

مشورہ کا درجہ

یعنی اسلام میں یہ درجہ ہے مشورہ کا کہ اگر نبی اور خلیفہ تو بدرجہ اولیٰ رعایا کے کسی آدمی کو کوئی مشورہ دیں تو اس کو حق ہے کہ مشورہ پر عمل نہ کرے اور یہ محض ضابطہ کا حق نہیں بلکہ واقعی حق ہے چنانچہ جب حضرت بریرہؓ نے حضور کے مشورہ پر عمل نہ کیا تو حضور نے ان سے ذرا بھی ناراض نہیں ہوئے نہ حضرت بریرہ کو کچھ گناہ ہوا نہ ان پر کچھ عتاب آیا۔ سو جب امت یا رعایا اپنے نبی یا بادشاہ کے مشورہ پر عمل کرنے کے لئے اسلام میں مجبور نہیں تو نبی یا خلیفہ رعایا کے مشورہ سے کیونکہ مجبور ہو جائے گا کہ رعایا جو مشورہ دے اسی کے موافق عمل کرے اس کی خلاف کبھی نہ کرے پس شاد وہم فی الامور سے صرف یہ ثابت ہوا کہ حکام رعایا سے مشورہ کر لیا کریں یہ کہاں ثابت ہوا کہ ان کے مشورہ پر عمل بھی ضرور کیا کریں اور اگر کثرت رائے بادشاہ کے خلاف ہو جائے تو وہ کثیرین کے مشورہ پر عمل کرنے کیلئے مجبور ہے۔ اور جب تک یہ بات ثابت نہ ہو اس وقت تک شاد وہم فی الامور جمہوریت پر گزرتا ثابت نہیں ہو سکتی۔ جب اسلام میں ایک معمولی آدمی بھی بادشاہ کے مشورہ پر مجبور نہیں ہوتا تو ہم بادشاہ کو رعایا کے مشورہ پر کیوں کہ مجبور کرتے ہو۔ آخر اس کی کوئی دلیل بھی ہے یا محض دعویٰ ہی دعویٰ ہے۔ اور ہمارے پاس حدیث بریرہ رضی اللہ عنہا سے دلیل موجود ہے کہ کسی کے مشورہ پر عمل نہ کرنا ضروری نہیں خواہ نبی ہی کا مشورہ کیوں نہ ہو۔

مشورہ پر عمل ضروری نہیں

اس سے یہ بات ثابت ہو گئی کہ اگر حکام رعایا سے مشورہ لیں تو وہ ان کے مشورے پر عمل کرنے کیلئے مجبور ہرگز نہیں ہیں بلکہ عمل خود اپنی رائے پر کریں خواہ وہ دنیا بھر کے مشورہ کے خلاف ہی کیوں نہ ہو۔

چنانچہ اس آیت میں آگے ارشاد ہے فَإِذَا عَزَمْتَ فَتَوَكَّلْ عَلَى اللَّهِ کے مشورے کے بعد جب آپ ارادہ کسی بات کا کریں تو خدا پر بھروسہ کر کے اس پر عمل کریں یہاں إِذَا عَزَمْتَ صیغہ واحد ہے۔ معلوم ہوا کہ عزم میں حضور صلی اللہ علیہ وسلم مستقل تھے۔ اسی طرح آپ کا نائب یعنی سلطان بھی عزم میں مستقل ہے۔ اگر عزم کا مدار کثرت رائے پر ہوتا تو إِذَا عَزَمْتَ نہ فرماتے بلکہ اس کی بجائے اِذَا عَزَمْنَا لَکُمْ فَتَوَكَّلْ عَلَى اللَّهِ فرماتے۔ پس جس آیت سے یہ لوگ جمہوریت پر استدلال کرتے ہیں اس کا اخیر جزو خود ان کے دعویٰ کی تردید کر رہا ہے مگر انکی حالت شہ ہے حفظت شئیئاً وغایت عنک اشیاء کہ ایک جزو کو دیکھتے ہیں اور دوسرے جزو سے آنکھیں بند کر لیتے ہیں۔ دوسرے اس آیت میں صرف حکام کو یہ کہا گیا ہے کہ وہ رعایا سے مشورہ کر لیا کریں۔ رعایا کو تو یہ حق نہیں دیا گیا۔ کہ از خود استحقاقاً حکام کو مشورہ دیا کہ چاہے وہ مشورہ لیں یا نہ لیں اہل مشورہ انکو مشورہ سننے پر مجبور کر سکیں چنانچہ شریعت میں اشیاء و المحکام دھوکہ علیہم، کہیں نہیں کہا گیا۔ جب رعایا کو از خود مشورہ دینے کا کوئی حق بدرجہ لازم نہیں تو پھر اسلام میں جمہوریت کہاں ہوئی۔ کیونکہ جمہوریت میں تو پارلیمنٹ کو از خود رائے دینے کا حق ہوتا ہے چاہے بادشاہ ان سے رائے مان لے یا نہ لے۔ یہاں تک کہ اگر بادشاہ پارلیمنٹ سے بغیر رائے لئے کوئی حکم نافذ کر دے تو اس پر چاروں طرف سے دے ہوتی ہے کہ ہم سے بدوں مشورہ لئے یہ حکم کیوں جاری کیا گیا۔ بھلا رعایا کو یہ حکم میں اسلام میں کہاں دیا گیا ہے ذرا کوئی صاحب ثابت تو کریں۔ پس یہ دعویٰ بالکل غلط ہے کہ اسلام میں جمہوریت کی تسلیم ہے۔ (تفصیل الاختلاط مع الامام ص ۱۸)

(۱۲) امن عامہ کا مل طور پر دین پر قائم ہونے سے ہی حاصل ہو سکتا ہے

مولوی اسی کو روتے ہیں کہ آپ کے گھر میں آگ لگی ہے۔ لیکن آپ کو خبر نہیں، صابو! غضب ہے کہ غیر تو میں تو اسلام کی تعریف کرتی چلی آرہی ہیں اور ہم اسلام کو چھوڑتے چلے جا رہے ہیں۔ غرض چونکہ ہم لوگوں نے دین کا ست نکال لیا ہے اس لئے میں بتلاتا ہوں کہ دین واقع میں چند چیزوں کے مجموعہ کا نام ہے اور وہ پانچ چیزیں ہیں عقائد، عبادات، معاملات، آداب، معاشرت باطنی، یعنی یہ کہ تکبر نہ ہو، ریا نہ ہو، تواضع ہو، اخلاص ہو۔

تعاونت ہو، شکر ہو، صبر ہو، وعلیٰ ہذا۔ پس ان پانچ چیزوں کا نام دین ہے اس وقت کسی نے کسی کو کسی نے کسی کو چھوڑ رکھا ہے۔ کسی نے اعمال کو چھوڑا، کسی نے معاملات کو، کسی نے معاشرت کو، اسی طرح اپنی معاشرت کو چھوڑ کر غیروں کی معاشرت کو اختیار کر لیا ہے۔ اور بعض نے اخلاق باطنی کو چھوڑ دیا ہے۔ بلکہ ان اخیر کے دو جہزوں کو تو قریب قریب سب ہی نے چھوڑ دیا ہے۔ اس تفصیل کے بعد حاصل آیت شریف کا یہ ہوا کہ دین کو یعنی ان پانچ چیزوں کو اصلاح فی الارض میں اور ان پانچوں کے اخلاق کو انسانی الارض میں دخل ہے۔ بس اب کو دیکھ دیے۔

مشاہدہ کہ اصلاح فی الارض میں جدا جدا ہر ایک کا کیا دخل ہے۔ سنو! بعض کا دخل تو بین ہے۔ مثلاً اخلاق ان اثر امن عام میں ہیں اور دوسری غور سے معاملات کا اثر بھی امن عام میں ظاہر ہو جائے گا۔ کیونکہ محکم معاملہ کا اصل حقیقت یہ ہے کہ کسی کا حق ضائع نہ کیا جائے۔ پس معاملات کو بھی اتفاق میں بڑا اثر ہے بشرطیکہ وہ شریعت کے موافق ہوں۔ کیونکہ آپ کی رائے ان مصالح کی رعایت نہیں کر سکتی جیسی کہ شریعت نے کی ہے۔ جیسے پھل فروخت کرنا کہ آپ نے قبل از وقت پھل فروخت کئے تو اس صورت کو شریعت نے حرام کیا ہے۔ کیونکہ پھل آئے سے پہلے فروخت کرنے میں معدوم کی بیع ہے اور بیع معدوم میں کسی نہ کسی کا ضرر ضرور ہوتا ہے۔ اور شریعت کے موافق کرنے میں کسی کا ضرر نہیں۔ تو امن قائم ہوگا۔ تو ان دونوں کا اثر تو دنیا کے انتظام میں صاف معلوم ہوتا ہے باقی اور تین چیزوں امن عام میں دخیل ہونا سوچ کر ظاہر ہے اس لئے اس کو بھی ثابت کرنا ضروری ہے کہ یہ تین چیزیں بھی امن عام میں دخیل ہیں۔

عقائد

سوا دل یعنی عقائد کو تو لیون سمجھو کہ توحید اور رسالت اور معاد، ام العقائد ہیں اور ان سب کو امن عام میں دخیل مان لیا ہے اس کی تسلیم سے یہ دعویٰ بھی ثابت ہو جائیگا ایک مثال بطور نمونہ کے عرض کرتا ہوں کہ مثلاً اخلاق میں جھوٹ نہ بولنا، سچ بولنا، ہمدردی کرنا، خود غرضی نہ کرنا داخل ہے اور یہ اصول تمدن میں سے بہت بڑی چیزیں ہیں جن پر تمام دنیا کا مدار ہے لیکن واقعات میں غور کرنے سے معلوم ہوتا ہے کہ اگر یہ اخلاق و دشمنوں میں پائے جائیں جنہیں ایک تو توحید و رسالت کا قائل ہے۔ اور دوسرا قائل نہ ہو تو یقیناً دونوں میں بہت بڑا فرق ہوگا۔ یعنی منکر توحید میں تو یہ اخلاق محدود العمر ہوں گے، اس طرح سے کہ جب تک ان اخلاق پر عمل کرنے میں اس کے دنیاوی منافع فوت نہ ہوں یا اس کے خلاف عمل کرنے سے دوسروں کو خبر ہو کر رسوائی کا اندیشہ ہو اس وقت تو ان اخلاق پر عمل کیا جائے گا اور اگر کوئی ایسا موقع آ پڑے گا کہ ان اخلاق

عمل کرنے سے دنیوی ضرر ہوتا ہو اور ان کے خلاف کرنے میں کسی کو خبر بھی نہ ہو جس میں اندیشہ بدنامی نہ ہو تو اس منکر توحید و رسالت کو کبھی ان اخلاق کے ترک کی پروا نہ ہوگی۔ ہم آئے دن دیکھتے ہیں کہ جب کبھی بے دین سلطنتوں میں آپس میں معاہدہ ہوتا ہے تو اس کی پابندی اسی وقت تک کیجاتی ہے جب تک اپنے منافع حاصل ہوتے ہیں یا خلاف کرنے میں اپنا ضرر ہوتا ہے اور اگر خلاف کرنے میں اپنا ضرر نہ ہوتا ہو تو عہد شکنی میں ذرا بھی پس و پیش نہیں ہوتا۔

ندہی طاقت کی مثال

یا قرض کر دکھ دو شخص ہم سفر ہوں جن میں ایک کے پاس ایک لاکھ روپے کے نوٹ ہوں اور دوسرا ایسا ہو کہ اس پر فائدے گزرتے ہوں اور اتفاق سے وہ متمول انتقال کر جائے۔ اور دوسرا فقیر سفر کو ان نوٹوں کے لئے لینے کا موقع ملے اور عاقل بھی اتنا بڑا ہو کہ بلا تکلف انکو فروخت کر کے اور اس مرحوم کے ورثہ میں بھی صرف ایک نابالغ بچہ ہو اور ان نوٹوں کی کسی اور کو خبر بھی نہ ہو کہ اس شخص کے پاس یہ ذخیرہ ہے اس صورت میں اخلاق اور نفس میں کشاکش ہوگی۔ اخلاق کا فتویٰ تو یہ ہوگا کہ یہ روپیہ اس وارث کو دینا چاہئے اور نفس کا فتویٰ یہ ہوگا کہ جب اس روپے کے رکھ لینے میں کوئی بدنامی نہیں۔ کسی قسم کا اندیشہ نہیں تو پھر اس کو کیوں نہ رکھ لیا جاوے۔ اس کشاکش میں میں نہیں سمجھتا کہ نری اخلاقی قوت انسان کو اس عظیم بہکے سے بچائے پس جس شخص کو نری اخلاقی تعلیم ہوئی ہے وہ ہرگز اس خیانت سے نہیں بچ سکتا، البتہ جو اخلاقی تعلیم کے ساتھ خدا اور قیامت کا بھی قائل ہے وہ اس سے بچ سکتا ہے کیونکہ وہ جانتا ہے کہ اگر میں یہاں بچ گیا اور مجھے دنیا میں خمیازہ بھگتنا نہ پڑا تو قیامت میں تو ضرور ہی بھگتنا پڑے گا۔

خوف خدا کا اثر

اسی طرح ایک اور جزئی یاد آگئی کہ میرے پاس اکثر ایسے ٹکٹ آجاتے ہیں کہ ڈاک خانے کی ہر سے بالکل بچے ہوئے ہوتے ہیں۔ اگر میں ان کو استعمال کو لوں تو کوئی بھی باز پرس نہیں کر سکتا کیونکہ ٹکٹ میرے پاس ڈاک خانے والے ہوتے ہیں نہ کوئی دوسرا دیکھنے والا ہوتا ہے لیکن محض خدا کے خوف سے اکثر میں سب سے اول ان ہی کو چاک کر کے پھینک دیتا ہوں۔ اس کے بعد خط پڑھتا ہوں علیٰ ہذا اگر روز مرہ کے واقعات کو دیکھا جائے تو معلوم ہوگا کہ دوسروں کے حقوق کی پوری حفاظت جب ہی ہو سکتی ہے جب دل میں خدا کا خوف ہو۔ یہ مثال نمونہ کے طور پر بیان کی ورنہ غور سے معلوم ہوگا کہ تمام مسائل تمدن میں اس کی ضرورت ہے کہ مبدأ اور معاد کا معتقد ہو۔ اس کی تفصیل کے لئے رسالہ مآل التہذیب

دیکھنے کے قابل ہے اس میں دکھلایا ہے کہ اس خیرِ تہذیب کا مال دنیا ہی میں ہونے والا ہے۔ انھوں نے ایک مفسدہ کو نکھایا ہے۔ اور ختم پر ہر جگہ یہ کہہ دیتے ہیں فویل یومئذ للمعدن بین غرض امن عام اور تمدن اس وقت باقی رہ سکتا ہے جب اخلاق درست ہوں اور اخلاق کی کامل درستی جیب ہی ہو سکتی ہے کہ عقائد درست ہوں۔

اعمال کا دخل

اب اعمال کا دخل لیجئے۔ یہ بھی انشاء اللہ اخلاق کی ضرورت تسلیم کر لینے سے ثابت ہو جائے گا۔ نسب کو معلوم ہے کہ اخلاق میں بڑی چیز تو وضع ہے۔ اس کے نہ ہونے سے تمام عالم میں فساد پھیلتا ہے کیونکہ فساد کا مبنی ہے نا اتفاقی اور نا اتفاقی تکبر سے پیدا ہوتی ہے کیونکہ اگر تکبر نہ ہو اور آپ مجھ کو بڑا مانیں اور میں آپ کو بڑا مانوں تو نا اتفاقی کی کوئی وجہ نہیں۔

تو اتفاق کے لئے تواضع کے پیدا کرنے اور تکبر کے مٹانے کی ضرورت ہے۔ اور اس تواضع کی عادت نماز سے خوب ہوتی ہے۔ نفس کا یہ خاصہ ہے کہ اگر کہیں اس کو ذلت سکھائی جائے تو اس میں فروغیت پیدا ہوتی اور نماز میں تو اول سے اللہ اکبر کی تعلیم ہے۔ تو جو شخص پانچ وقت زبان سے اور دل سے اللہ اکبر کہے گا اور جو ارج سے رکوع اور سجدہ کرے گا۔ زمین پر پیشانی رکھے گا وہ کیونکر اپنے کو بڑا سمجھے گا۔

خدا کی خدائی پر اعتقاد کا نتیجہ

اگر کہو اس سے تو یہ ہو گا کہ اپنے کو خدا سے بڑا سمجھے گا لیکن دوسروں سے تو بڑا نہ سمجھنے کی کوئی وجہ نہیں۔

جواب یہ ہے کہ یہ نا تجربہ کاری کا اثر ہے۔ دیکھو اگر تحصیلدار اپنے جوش حکومت میں تحصیلداری کر رہا ہو اور جانتک لفٹنگ گورنر آجائے تو خود اس کے ذہن میں بھی وجداناً سب اختیارات مسلوب ہونے لگتے ہیں اس وقت اگر کوئی حضور بھی کہہ دیتا ہے تو یوں معلوم ہوتا ہے جیسے کسی نے گولی مار دی تو جس کے دل میں خدا کی عظمت ہوگی وہ اپنے کو جیونٹی سے بھی مغلوب و ناتواں سمجھے گا کیونکہ بڑوں کے سامنے ہوتے ہوئے جھوٹوں پر بھی حکومت نہیں رہتی۔ تو اللہ اکبر کی وہ تعلیم ہے کہ اس سے تکبر کی بالکل جڑ کٹ جاتی ہے اور پھر اس سے نا اتفاقی کا جاتا رہنا لازمی ہے۔

اعمال دین کے اثرات

علیٰ انذا قوت۔ یہیمہ سے سینکڑوں فساد لڑائی جھگڑے دنیا میں ہوتے ہیں اور روزہ سے قوت یہیمہ ٹوٹی ہے

اسی طرح زکوٰۃ لینے والے کے علاوہ دوسروں کو بھی زکوٰۃ دینے والے کے ساتھ محبت ہوتی ہے۔

دیکھو حاتم طائی بوجہ سخاوت کے سب کو محبت ہے اور اتفاق کا مبنی یہی محبت ہے تو دیکھو زکوٰۃ کو اتفاق میں کتنا بڑا دخل ہے۔

علیٰ لہجہ پر غور کیجئے کہ اس میں ساری دنیا کے آدمی ایک شغل میں، ایک زمانہ میں ایک مکان میں جمع ہوتے ہیں اور تمام سامان تکبر سے خالی ہو کر ایک عظیم الشان دربار میں حاضر ہوتے ہیں جس کو اتفاق و اتحاد میں بہت دخل ہے جیسا اور پر مذکور ہوا۔ اور اسی اتفاق فی الخیال کا اثر ہے کہ دوسرے مجموعوں میں جن کو مجمع حجاج سے کچھ بھی نسبت نہیں ہوتی بہت سی واردات ہو جاتی ہیں اور وہاں بہت کم حادثے پیش آتے ہیں۔

البتہ اگر لوگ شاید بدوؤں کے شاکی ہوں گے۔ سواصل میں ان کا مقصود سلبِ قتل نہیں ہے بلکہ وہ ایک درجہ میں حجاج کی بے پروائی کا انتقام لیتے ہیں ان کی حالت بالکل یہاں کے گاریبانوں کی سی ہے کہ اگر گھاس دانہ زیادہ دے دیا تو خوش ہیں ورنہ پھر دیکھئے کیسے پیر پھیلاتے ہیں۔ ویسے ہی اگر بدوؤں کی مدارات کیجائے انکو انعام کے طور پر کچھ زیادہ دیدیا جائے تو وہ بہت آرام پہنچاتے ہیں۔

اور یہ جو سننے میں آتا ہے بدو پتھر مار کر مال چھین لیتے ہیں۔ تو اول تو بہت کم ایسا ہوتا ہے اور اگر ہوتا بھی ہے تو ویسے بدوؤں کے ہاتھ سے جو اس مجمع کے نہیں بلکہ وادیوں میں دیہات کے لوگ پھیلے رہتے ہیں۔ وہ ایسی حرکتیں کرتے ہیں اور وہ بھی اس وقت جب کہ خود اپنی حفاظت نہ کر کے کہیں قافلے سے آگے پیچھے رہ جائے۔

غرض حجاج کو اتفاق دامن میں بہت بڑا دخل ہے جس کی بڑی وجہ یہ ہے کہ اعمال از سر تا پا تواضع سے پُر ہیں۔

اب رہی معاشرت۔ سوائس سے معلوم ہوتا ہے کہ اس کے جتنے طریقے ناجائز ہیں وہ سب کے سب وہی ہیں جن سے تکبر ٹپکتا ہے۔ مثلاً ناجائز دفع سے شریعت نے منع کیا۔ سو جتنی ناجائز اوضاع ہیں ان سب میں تکبر ہے۔ جو لوگ خلاف شریعت وضع رکھتے ہیں وہ غور کریں کہ

اس وقت ان کے دل کی کیا حالت ہے اور اس حالت کو یاد رکھیں اور پھر ایک ہفتہ شریعت کے موافق وضع لباس اختیار کر کے اس کا اثر دیکھیں تو ان کو زمین و آسمان کا فرق معلوم ہوگا۔ یہ تو سمجھ میں آنے والی تقریر ہے۔

عقائد و اعمال کی خاصیت | ایک دوسری تقریر اور ہے جو ان تینوں میں مشترک ہے وہ یہ کہ ہر چیز میں ایک خاصیت ہوتی ہے۔ پس اس طرح اعمال میں بھی ایک خاصیت ہے اور عقائد میں بھی اور معاشرہ میں بھی اور وہ یہ کہ ان سب سے قلب میں ایک سوز پیدا ہوتا ہے اور اس سوز سے اس کی وہ حالت پیدا ہو جاتی ہے۔ المسلم من سلم المسلمون من لسانہ و یدہ۔

اب میں ایک اور بات کہتا ہوں جو تمام اجزاء دین کو عام ہے وہ یہ کہ دین کی ہر غرض ہی نہیں کہ دنیاوی نفع ہو بلکہ مقصود اس سے رضائے حق ہے اور جب خدا تعالیٰ راضی ہوں گے تو وہ خود ہی اس کی تمام مصالح دنیویہ کی رعایت فرمائیں گے۔ من یقن الله یجعل لہ فخر جہاد یومزقہ من حیث لا یحسب۔

پس دین کی درستی کو اس طرح دنیا کی درستی میں دخل ہو مگر دین کے کام اس نیت سے بھی نہ کرنا کہ خدا راضی ہو گا تو دنیا کے کام بنیں گے بلکہ صرف اس لئے کہ

دلارامی کہ داری دل درو بند :۔ وگر چشم از ہمہ عالم فرو بند اور جو مصلحتیں ملنے آئیں بھی تو یہ پڑھ دو کہ

مصلحت دیدن آست کہ یاں ہر کار :۔ بگزارد خم طرہ یارے گیرند زند عالم سوز را با مصلحت بین چہ کار :۔ کار ملک است آنکہ تدبیر تجل بایش

ہمیں مصلحتوں سے کیا لینا مگر حاصل ضرور ہوگی۔ وفا دار نوکر وہ ہے کہ آقا کی رضامندی کو اپنی مصلحت پر مقدم رکھے۔ اور کوئی کام اس کی مرضی کے خلاف نہ کرے ورنہ اس کو غرض اور خود کام کہا جائے گا۔ پھر آقا اپنے کرم سے خود ہی اس کی مصلحتوں کی رعایت فرمائے گا۔ اور اگر دیکھا جائے تو راحت بھی اسی میں ہے کہ کسی کے حکم کے تابع رہے چاہے مصلحت سمجھ میں آئے یا نہ آئے اور اگر ہر کام میں مصلحت سوچا رہے تو کام کچھ نہ کر سکے گا۔

میں نے تین تقریریں کیں۔ ہر تقریر سے یہ ثابت ہو گیا کہ دین کو، طاعت کو امن عام میں بہت دخل ہے اور یہ تین تقریریں اس لئے کیں کہ مذاق مختلف ہیں۔ یہ تو اعداد دینیہ کی

خوبی ہے کہ ان سے ہر مذاق کے پسند پر دین کا حسن ثابت ہو گیا تو دین کو یا اس شعر کا مصلحت ہی ہے

بہار عالم حشش دل دجاں تازہ می دارد

برنگ اصحاب صورت را بہوار باب معنی را

غرض جس پہلو سے چاہو پرکھو، الحمد للہ یہ بات ثابت ہو گئی کہ امن کی صورت ہے تو احکام خداوندی کی پابندی سے ہے۔ (ضرورۃ العلماء ص ۱۲)

۱۳۔ دین میں تنگی اور دشواری نہیں ہے

اس کے دو درجے ہیں ایک تو یہ کہ قانون کی پابندی کرنا پڑتی ہے اور یہ دشوار ہے۔ اور ایک یہ کہ خود قانون ہی سخت ہے۔ تو اسلام میں کون سی دشواری ہے آیا یہ کہ خود قانون کی پابندی کرنی پڑتی ہے تو تسلیم ہے کیونکہ اس میں ضرور دشواری ہوتی ہے خواہ کتنا ہی سہل قانون ہو۔ مثلاً جو لوگ کہ عدالت میں نوکر ہیں اور ان کا وقت دس بجے سے ہے تو کیا کبھی یہ پابندی دشوار نہیں ہوتی۔ ضرور ہوتی ہے اور اس وقت کہتے ہیں کہ نوکری بڑی ذلت کی چیز ہے مگر اتنی ہی بات پر اس کو کبھی نہ چھوڑ دیا۔ تو جب قانون کی پابندی ہوگی اس میں دشواری ضرور ہوگی تو اگر اسلام میں یہ دشواری ہے تو تسلیم ہے بلکہ اس کو تو خود ہی ثابت کرتے ہیں لا تبغوا الہوی اور اس سے صاف انہا لکبیرۃ الاعلیٰ الخاشعین۔

غرض یہ دشواری تو تسلیم ہے مگر اس میں اسلام کی کیا تخصیص ہے تو سبھی کام میں بلکہ کھانے میں بھی ہے۔ کوئی اپاہجوں سے پوچھے خاص کر واجد علی شاہ کے احادیث سے کہ کھانا کتنا مشکل کام ہے۔

ایک حکایت | مشہور ہے کہ داجد علی شاہ کے یہاں دو اہدی تھے ان میں باری اس طرح تھی کہ ایک لیٹا ہوا آرام کرے دوسرا بیٹھا ہوا اس کی حفاظت کرے اسی طرح ایک لیٹا ہوا تھا ایک بیٹھا ہوا، ایک سوارا دھر سے گذرا۔ لیٹے ہوئے نے پکارا کہ میاں سوارا ذرا یہ بیرو میرے سینہ پر رکھا ہے میرے من میں ڈل دو۔ اس کو آرام طلبی سے سخت

حیرت ہوئی۔ اور اس سے زیادہ حیرت یہ ہوئی کہ اس کا رفیق جو پاس بیٹھا ہے اس سے اتنا کام نہیں ہوتا۔ اس لئے اس بیٹھے ہوئے سے کہا کہ بھائی تو ہی اس کے منہ میں ڈال دے۔ وہ بہت بگڑا اور کہنے لگا کہ جناب میری آپ کی لڑائی ہو جائے گی۔ آپ کو کیا خبر میرے ساتھ کیسا ہے۔ کل میں لیٹا تھا یہ بیٹھا تھا مجھ کو جو جمائی آئی اس سے منہ کھل گیا۔ ایک کتا اگر منہ میں مونتے لگا، یہ بیٹھا ہوا دیکھتا رہا اور اس سے اتنا نہ ہوا کہ کتے کو ہٹا دے، میں ضرور اس کے منہ میں پیرد دگا۔ یہ سوار حیرت میں غرق ہو گیا اور لاجول پڑھتا ہوا چل دیا۔

تو حضرت اگر کوئی احادیث سے پوچھے تو ان کو کھانا بھی مشکل ہے۔ ہمارے عزیز و بھائی ہیں ایک چھوٹے ایک بڑے۔ بڑے صاحب ہاتھ پاؤں لپیٹ کر بیٹھ جاتے ہیں اور چھوٹے سے کہتے ہیں کہ میرے منہ میں لقمے دے کر مجھ کو کھانا کھلا۔

دشوازیوں کی قسمیں
تو ایسی نظریں بھی موجود ہیں اور رہیں گی تو اس طرح تو کھائے میں بھی دشواری ہے اور اس میں شرعی اور قانونی پابندیاں بھی ہیں مثلاً یہ کہ دوسرے کی چیز نہ کھاؤ اور ڈکیتی نہ ڈالو مگر اس کو کسی نے کہا کہ بڑا سخت قانون ہے۔ وجہ یہ کہ آپ کو ڈکیتی ڈالنا ہی نہیں ہے۔ اس لئے آپ کو اس کی ممانعت کا قانون سخت معلوم نہیں ہوتا۔ اور رشوت لینا مقصود ہے اس لئے اس کی ممانعت سخت معلوم ہوتی ہے لیکن جو دیکتی ہمیشہ ہیں ان سے کوئی پوچھے اس ممانعت کے قانون کو کتنا سخت سمجھتے ہیں۔ اسی طرح ایک عجات بے ہودوں کی ایسی بھی ہے کہ ان کی رائے یہ ہے کہ کوئی سلطنت نہ ہو حالانکہ ضرورت سلطنت کا قانون امر فطری ہے مگر یہ ان کو گراں ہے۔ تو ایسے لوگ تو انسانیت ہی سے خارج ہیں۔ تو محض پابندی سے کوئی بھی نچ نہیں سکتا پھر اسلام ہی پر کون اعتراض ہے۔

دوسرا درجہ یہ ہے کہ پابندی کی ضرورت کو تسلیم اور یہ سختی نہیں مگر خود قانون ہی بڑا سخت ہے تو واقعی یہ دشواری ہے مگر دین میں ایسی دشواری ہی نہیں کہ قانون سخت ہو۔

اب سب شبہ ہو گا کہ یہ تو مشاہدہ کے خلاف ہے تو حقیقت میں اس میں تبلیہیں ہوئی ہے قانون کی سختی تو وہ ہے کہ اگر اس کو سب بھی مان لیں تب بھی دشواری پیش آوے۔ مثلاً یہ قانون ہو جائے کہ اگر چھٹا تک بھر سے زیادہ کوئی کھا دے تو پھانسی ہوگی۔ یہ ایسی سخت بات ہے کہ اگر سب عمل کرنے کا ارادہ کریں تب بھی کیفیت ہو۔

اور ایک دشواری اس طرح کی ہے کہ قانون تو نرم ہے۔ اور علامت اس کی یہ ہے کہ اگر

سب اس پر عمل کرنے لگیں تو کسی کو بھی دشواری پیش نہ آوے لیکن اس میں ایک خاص عارض سے سختی پیش آجائے، وہ عارض یہ ہے کہ زیادہ آدمی اس پر عمل نہیں کرتے پس جب تھوڑے آدمی عمل کریں گے تو ان کو دوسروں کی وجہ سے ضرورت تگی ہوگی کیونکہ تعلق معاملات کا ان ہی دوسروں سے ہے۔ تو اس کو قانون کی سختی نہ کہیں گے بلکہ اس سختی کا منشا ان باغیوں کی بغاوت ہے۔

ایک مثال

پہونچ کر کوئی چیز خریدے اور دام دیدے پھر اس سے کہا جائے کہ قانون سلطنت یہ ہے کہ پورے دام لے کر پوری چیز دے دو مگر ہم اس قانون کو نہیں مانتے اسلئے تم کو آدھی چیز ملے گی۔ تو ایمان سے کہتے کہ یہ دشواری قانون کی ہے یا ان بد معاشوں کی بد معاشی۔ قانون کا منشا تو یہ ہے کہ سیر بھر کی سیر بھر دو مگر ان بد معاش لوگوں نے بد معاشی کی اور سیر بھر کی آدھ سیر دی۔ تو اس دشواری سے اگر کوئی گورنمنٹ کو برا کہنے لگے تو وہ احمق ہے یا نہیں۔ تو جو دشواری اس وقت پیش آرہی ہے وہ دشواری یہ ہے جس کو اسلام پر تقویا جاتا ہے۔ کوئی شخص اسلام کا کوئی ایسا قانون بتلائے کہ سب مسلمانوں کے مان لینے اور عمل کرنے کے بعد بھی اس میں دشواری پیش آوے۔ اگر پچاس قباحتیں بھی آجاویں جب بھی شریعت کا کوئی ایک قانون بھی ایسا نہیں بتلا سکتے۔ صرف موجودہ دشواری کی وجہ یہ ہے کہ نافرمانیوں سے سابقہ پڑ رہا ہے۔

مثلاً قرض کی ضرورت ہوئی اب جس کے پاس جاتے ہیں وہ کہتا ہے کہ سود لاؤ۔ تو سود کی حرمت کا الزام شریعت پر دینا اور اپنے کئے کا اسلام پر تقویا ایسا ہے کہ سہ

حکمہ بر خودی کنی اے سادہ مرد : ہچوں آں شیرے کہ بر خود حملہ کرد
مشوئی میں شیر کی ایک لمبی چوڑی حکایت لکھی ہے کہ ایک شیر کو ایک خرگوش نے دھوکا دیا اور کہا کہ میں تمہارے راتب کیلئے ایک موٹا خرگوش لاتا تھا راستہ میں ایک دوسرا شیر ملا اور مجھ سے چھین لیا شیر کو غصہ آیا کہ بتلا وہ کہاں ہے اس نے ایک کنوئیں پر لے جا کر کھڑا کر دیا۔ واقعی اس میں شیر کا عکس نظر آیا پس شیر اس کنوئیں میں جاگودا۔ اندر پہونچ کر معلوم ہوا کہ میں نے اپنے ہی اوپر حملہ کیا تھا مولانا اس کو فرماتے ہیں سہ

حکمہ بر خودی کنی اے سادہ مرد : ہچوں آں شیرے کہ بر خود حملہ کرد
اسی طرح ہم کو بھی اپنی دشواری کی صورت شریعت میں نظر آتی ہے مگر حقیقت میں یہ اپنے اوپر اعتراض ہے۔

اس پر ایک حکایت اور یاد آئی کہ ایک حبشی نے آئینہ دیکھا۔ اس میں اپنی صورت نظر پڑی آئینہ کو بڑے زور سے پتھر پر پھینک مارا کہ ایسا ہی بد شکل تھا تب ہی تو کوئی تجھ کو راستہ میں پھینک گیا۔

ایک اور احمق کی حکایت ہے کہ اس کا بچہ روٹی کھا رہا تھا لوٹے میں ایک ٹکڑا گر پڑا اچانک سے اپنی صورت نظر آئی سمجھا کہ اس میں کوئی کچھ ہے باپ سے کہا۔ ابا اس نے یہ میرا ٹکڑا لے لیا۔ آپ چھینے اٹھے جھانک کر دیکھا تو اپنی شکل نظر پڑی۔ بولے کہ لعنت ہو خدا کی بدھا ہو کہ بچہ کا ٹکڑا اچھین لیا۔ تفت ہے تیری اوقات پر۔ سو وہ تفت کس کو کہہ رہے تھے۔

اسی طرح ہم لوگوں نے آئینہ شریعت میں اپنی شکل کو دیکھا۔ اور وہ تنگی اپنی صفت تھی اس کو شریعت کی تنگی سمجھا۔ حضرت یہ ہے حقیقت سخی کی۔ اور میں ایک مثال دیا کرتا ہوں کہ ایک طبیب علاج کر رہا ہے اور بہت شفیق بھی ہے مگر نہ ایسا آراؤ کہ خاک پتھر سب کی اجازت دیدے۔ ظاہر ہے کہ جب غذا میں کھائی جاوے گی تو کسی چیز کی تو ضروری مانعت ہوگی اتفاق سے ایک دیہاتی پہونچا۔ کہ صاحب کھاؤں کیا۔ جواب دیا کہ بکری کا گوشت پالک، وہ بولایا تو ملتا نہیں۔ کہا مونگ کی دال۔ کہا یہ بھی نہیں ملتا۔ کہا فیر بنی۔ کہنے لگا یہ بھی نہیں۔ پھر خود پوچھا بینگن کھالوں۔ کہا ہرگز نہیں کھانا۔ کر ملا کو پوچھا اس کو بھی منع کر دیا آؤسے بھی روک دیا۔ تو دیہاتی نے کہا کہ صاحب ہمارے یہاں تو یہی چیزیں ملتی ہیں۔ طبیب نے کہا کہ فتویٰ طب کا یہی ہے۔ دیہاتی نے باہر آکر کہا کہ صاحب یہ تو بڑے سخت ہیں کہ یہ بھی نہ کھاؤ وہ بھی نہ کھاؤ۔

تو کیا طبیب پر یہ الزام صحیح ہے یا یہ کہا جاوے گا کہ وسعت تو یہ ہے کہ متعدد چیزوں سب کی اجازت دے دی لیکن وہ مقام ایسا کہ وہ ہے کہ بجز مضر چیزوں کے وہاں کچھ ملتا ہی نہیں تو یہ طب کی تنگی تو نہیں اس شخص کے گھاؤں والوں کی معاشرت کی تنگی ہے۔ اسی طرح حاجت ضروریہ پر نظر کر کے دیکھئے کہ معاش کی ضروری سیبیلوں کو جو کہ قریب الوقوع ہیں اگر تجھیں آپ نکالیں گے تو میں کو شریعت بجز کہے گی اور پانچ کو لایو جو لیکن آپ کے ملک والے ہمیشہ ان ہی پانچ کو استعمال کریں اور میں کو مٹروک کر دیں تو تنگی معاشرت کی ہوئی یا قانون شریعت کی۔ پس یہ الزام تو بھلائیہ و جہ احسن و اکمل رفع ہو گیا۔ اور اگر اس کی تصدیق میں شبہ ہو تو علم دین پر رہے اس سے معلوم ہو گا کہ

شریعت نے ابواب معاش میں کس قدر توسیع کی ہے۔

اب صرف ایک فرما رہی گئی ہے اس میں ہی چاہتا ہے
ایک اشکال اور اس کا حل

میں آگیا کہ شریعت میں تو دشواری نہیں مگر حالت موجود ہیں اس عارض کے سبب کہ ہم کو سابقہ ایسوں سے پڑا ہے جو شریعت پر عمل نہیں کرتے۔ عارضی دشواری تو ہوگی۔ تو ہم پر تو دشواری کا اثر آخر پہونچ گیا البتہ اعتقاد درست ہو گیا کہ شریعت میں دشواری نہیں مگر عمل کس طرح سے کریں کیا لین دین چھوڑ دیں۔ کیونکہ لوگ ریاں اکثر ناجائز معاملات اکثر ناجائز تجارت اکثر ناجائز تو یہ ایک فرمایہ قابل استماع ہے تو اس کے متعلق بھی سن لیجئے۔

اس میں قدرے تفصیل ہے وہ یہ کہ آپ نے جو چند معاملات کو دیکھا کہ اس عارضی دشواری کے اعتبار سے عام حکم کر دیا کہ سب ہی دشوار ہے۔ غیر مسلم ہے۔ سمجھئے کہ ایسے اعمال دوسم کے ہیں ایک وہ کران کی اصلاح کرنے سے معاش کی گاڑی کچھ آگئی ہے اور ایک وہ کران کی اصلاح سے معاش کا کچھ بھی نقصان نہیں مثلاً وضع شریعت کے موافق بنائے نماز روزہ کرے۔ تنکیر نہ کرے باجا گا جھوڑ دے تو بتلائیے اس میں معاش کا کیا نقصان ہے؟ تو آج ہی سے اصلاح کر لیجئے پس زیادہ اعمال تو آپ کے آج ہی سے درست ہو جائیں گے کیونکہ پچاس عمل میں چالیس ایسے نکلیں گے کہ محض گناہ بے لذت ہیں کہ خواہ مخواہ آپ نے انکو اپنے پیچھے لگا رکھا ہے۔ آگے دس ہی رہ جاویں گے اس میں اگر آپ کی اصلاح نہ بھی ہوئی تو چونکہ غالب درجہ اعمال ہلالہ کا موجود ہو چکا ہے۔ اس لئے حق تعالیٰ سے امید ہے کہ بقیہ اعمال کو جو کہ مغلوب و قلیل ہیں درست فرمادیں گے۔

جیسے ایک شعلہ جو الہ کے دیکھنے میں پورا دائرہ شعلہ نظر آتا ہے حالانکہ اس میں بہت چھوٹی قوس نورانی ہے اور بڑی قوس ظلمانی مگر جب نور و ظلمت جمع ہوتے ہیں تو نور ہی غالب آتا ہے اور اس درستی میں گویا یہ کہا جاسکتا ہے کہ اس کی خاصیت ہی یہ ہے جیسے مقناطیس کہ بالخاصہ جاذب حدید ہے پس اگر ہم یہ کہیں کہ اعمال ہلالہ میں بھی خاصیت یہی ہے کہ بقیہ اعمال کو درست کر دیتا ہے تو اس کا دعویٰ ہو سکتا ہے مگر میں اس کا راز بھی بتلاتا ہوں کہ اعمال ہلالہ میں ایک اثر ہے کہ اس سے قلب میں قوت ہوتی ہے اور صحابہ کی ترقی کا راز یہی ہے ہم نے بزرگوں کو دیکھا ہے کہ بیماری میں اٹھا نہیں

جاننا مگر نماز کے وقت بلا تکلف کھڑے ہو کر نماز ادا کر لیتے ہیں۔ خوب کہا ہے

ہر چند کہ پیر خستہ دلبس نا توں شدم
ہر گز نظر بردے تو کرم جوں شدم

ان کی خدمت میں جب جی چاہے جاکر دیکھ لیجئے
بندگی سے قوت آتی ہے

غرض طاعت سے قوت ہوتی ہے اور اصلاح نہ کرنے کا صرف یہی سبب تھا کہ ہمت نہیں ہوتی تھی مگر جب قوت ہوگی تو تمام موانع مضمحل ہو جائیں گے اور اگر کوئی اس ڈر سے کہ کبھی اصلاح ہو جائے یہ تدبیر بھی نہ کرے تو دوسری بات ہے جیسے کسی نے یہ سن کر کہ چاند دیکھنے سے روزہ فرض ہو جاتا ہے کہا تھا کہ ہم چاند ہی نہ دیکھیں۔ غرض اس طرح قوت پیدا ہو جاتی ہے اور ضعف جاتا رہتا ہے۔

یہ ہے وہ راز اور اگر بالفرض اصلاح بھی ہوئی تو ایک اور بات تو ضرور پیدا ہو جاوے گی کہ اس معصیت کی مذمت آپ کے قلب میں جمی چلی جاوے گی اور اس سے نفرت پیدا ہو جاوے گی اور یہ مذمت و نفرت آپ کی اصلاح کر دے گی اور آخری بات یہ ہے کہ اگر اس طرح بھی اصلاح نہ ہوئی تو جرائم تو گھٹ گئے اگر ایک شخص پر چار جرم قائم ہوئے اور وکیل نے کہا کہ تین تو مل سکتے ہیں مگر ایک نہیں مل سکتا۔ تو کیا کوئی یہ کہے گا۔

کہ جوں آب از سرگندشت چہ یک نیزہ، چہ یک دست

ہر گز نہیں بلکہ تخفیف ہی کو غنیمت سمجھیں گے۔ تو اس طرح آپ بھی پچاس جرائم میں سے صرف دس ہی کے جرم رہ گئے۔

اب وہ حصہ رہ گیا جس میں تغیر کرنے سے معاش کا حرج ہے تو ادا تو چونکہ آپ کو شریعت کے احکام نہیں معلوم ہیں اس وجہ سے بہت سے افعال ناجائز صادر ہو جاتے ہیں اگر آپ احکام کی تحقیق کیجئے گا تو آپ کو معلوم ہوگا کہ تھوڑے تغیر سے وہ جائز ہو جاوے گا۔

چاندی کا مسئلہ مثلاً اگر آپ نے چاندی خریدی تو اس میں مسئلہ یہ ہے کہ چاندی کا مقابلہ اگر چاندی سے ہو تو زیادتی کمی حرام ہے۔ اگر اب کہئے کہ

صاحب اچھا مسئلہ سا کر نرخ کے حساب سے تو سو روپیہ کی چاندی ایک سو بیس بھرتی کر اب سو روپے کی سو بیس روپے بھر ملی۔ اچھا عمل کیا کہ بیس روپے کا خسارہ ہوا۔ اب ساری عمر کیلئے مولویوں کو خیر باد کہہ دیں گے۔

تو سنئے بات یہ ہے کہ اگر مولوی صاحب سے یوں پوچھتے کہ مولوی صاحب جب چاندی

میں زیادتی حرام ہے تو اب اگر اس پر اس خاص صورت میں عمل کریں تو بڑا نقصان ہوگا کیا کوئی جائز شکل بھی معاملہ کی ہے تو مولوی صاحب یوں کہتے کہ ان روپیوں میں ایک گنی بھی ملا تو ایک سو بیس بھر چاندی جو آدگے کی تو پچاس روپے بھر تو پچاس روپیہ کی آدے گی اور باقی کی اس گنی میں شریعت محسوب کرے گی۔ تم کو نیت کرنے کی بھی ضرورت نہیں شریعت خود فیصلہ کر چکی ہے۔ تو اب بتلائیے کیا نقصان ہوا اب مشکل تو یہ ہے کہ علماء سے پوچھتے بھی نہیں۔

صاحبو! پوچھتے رہو، اور میں یہ تو نہیں کہتا کہ سب کو مولوی صاحب جائز ہی کہہ دیں گے۔ کیونکہ شریعت ان کے گھر کی تو ہے نہیں کہ وہ اپنے اختیار سے جسے چاہیں جائز کر دیں جیسا کہ ایک مطوف سے ایک بڑھیا نے صفامروہ کی سعی میں تھک کر کہا تھا کہ مولوی صاحب اب تو معاف کر دو۔ اسی طرح بعضے لوگ یوں چاہتے ہیں کہ علماء ہند مثل بعض علماء مصر کے کرنے

علماء ہند

لگیں ان بعض علماء نے ایسا کر رکھا ہے کہ جو دنیا میں ہو رہا ہے سب جائز ہے۔ تو یہاں کے لوگ بھی یہی کرنا چاہتے ہیں علماء سے۔ جیسے ایک رئیس نے ایک نوکر سے یہ کام لیا تھا کہ جو ہماری زبان سے نکلے تم اس کی تصدیق کر کے توجہ کر دیا کرو۔ چنانچہ ایک بار اس رئیس کے منہ سے کہ ہم شکار کو گئے ایک ہرن پر گولی چلائی وہ اس کے سم کو توڑ کر مارتھے کو چھوڑ کر نکل گئی۔ سب اہل مجلس ہنسنے لگے کہ سم اور مارتھے کا کیا جوڑ۔ نوکر بولا سچ ہے حضور، وہ اس وقت سم سے پیشانی کھلارہا تھا۔

تو حضور علماء سے تو ایسی تو کری ہوتی نہیں۔ نہ ہم اتنے ذہین ہیں اور نہ خدا کرے کہ ہوں۔ تو حاصل یہ کہ یہ تو نہیں ہو سکتا کہ سب کو جائز کہہ دیں۔ مگر پوچھ کر دیکھو تو بہت سے اشکالات کا جواب مل جاوے گا۔ تو بہت بڑا حصہ اس عارضی دشواری کا اس طرح ختم ہو جاوے گا۔

ہاں بعض امور پھر بھی ایسے رہ جاویں گے کہ وہ بالکل ناجائز ہوں گے مگر اس میں بھی دو درجے ہیں ایک تو وہ کہ اس کو چھوڑ کر دوسرے کام میں لگ سکتے ہیں پس اسکو تو چھوڑ دیا جاوے۔ کیونکہ اس کا چھوڑنا مضروع ضروریہ نہیں۔ اور ایک وہ درجہ ہے کہ اس کو چھوڑ نہیں سکتے کیونکہ دوسرے کام اس کے حوائج ضروریہ کو کافی نہیں۔ تو بادل کا رہ اس کو کرتے رہو اور گویہ جائز تو نہ ہوں گے مگر اس کے متعلق ایک دستور العمل ایسا بتلاتا ہوں کہ اس سے ایسے جرائم خفیف ہو جاویں گے۔ اور یہ کہ اس میں دو برتاؤ کرنا چاہئیں ایک تو یہ کہ ہر روز تو یہ کیا کرے۔ اب تو یہ غضب ہے کہ لوگ تو یہ کی حقیقت نہیں سمجھتے۔ تو یہ کی حقیقت یہ ہے کہ جو کچھ کیا اس پر پڑ پڑنا ہے اور دماغی کچھ کہ

اے اللہ مجھے معاف فرمائیے مواخذہ نہ کیجئے۔

تو یہ کیوں نہیں کرے کیا ایسا کرنے سے نوکری سے موقوف ہو جاوے۔ ہرگز نہیں بلکہ بلکہ تم نوکر ہی رہو گے۔ دوسرے یہ دعا کیا کر دے اللہ کوئی دوسری سبیل نہ نکلی تو یہ شخص شرمندہ گنہگاروں کی فہرست میں تو کھاجا دے گا جرمی گنہگاروں کی فہرست میں نہیں لکھا جاوے گا۔ اور یہ تو وسیع آپ میری ہی زبان سے سنیں گے اور توسیع میں راز شرعی رہے کہ اگر چھوڑنے پر مجبور کیا جاوے تو شاید اس کو چھوڑ کر اس سے بھی زیادہ کسی گناہ شدید میں مبتلا ہو جاوے مثلاً یہی کہ چلو آریہ بنیں تو یہ توسیع "اے بلا دفع بلا ہائے بزرگ" کا مصداق ہے اور میں کفر سے بچا رہوں کیونکہ جب آدمی نادار ہوتا ہے تو خدا جانے کیا کیا اسکو سوچتا ہے۔

ایک واقعہ

ہمارے حضرت حاجی صاحب جب تھا نہ بھون میں رہتے تھے ایک پٹھان حضرت کی خدمت میں دعا کرانے آیا کرتے تھے کہ مجھ پر ایک شخص نے جائداد کے معاملہ میں بڑا ظلم کر رکھا ہے۔ حضرت دعا فرمادیتے۔ ایک بار آکر کہنے لگے کہ اب تو اس نے حد ہی کر دی اور جائداد غصب ہی کرتے کو ہے۔ حضرت نے فرمایا بھائی صبر کرو۔ اس نے کہا بہت اچھا دفعۃً حافظ محمد ضامن صاحب حجرہ میں سے نکل آئے اور اس پٹھان سے فرمایا۔ ہرگز موت صبر کرنا جاؤ نانش کرو اور ہم دعا کریں گے۔ اور حضرت نے فرمایا آپ تو صاحبہر شاکر تھے سب چھوڑ کر بیٹھ رہے اس میں واقعی قوت نہیں یہ اگر اسباب معاش کو چھوڑ دے گا تو جب حاجت ستائے گی یہ جھوٹی گواہی دے گا۔ چوری کرے گا تو ایسوں کو صبر نہیں کرایا کرتے۔

تو یہ ہے اصل راز اس توسیع کا۔ تو آپ کسی سے اتنی گنجائش نہ بنیں گے مگر یہ اسلئے ظاہر کر دیا گیا کہ کفر سے بچنا ہے۔ لیکن خدا کے لئے اس کو آپ تمام معاشی میں آڑ نہ بنالیں کہ یہ جزو بہت اچھا ہاتھ آیا۔

بات یہ ہے کہ اول تو یہ بہت تھوڑا حصہ ہے سب معاشی میں اس کا توڑ یہ نہیں ہو سکتا۔ دوسرے اس میں یہ بھی قید لگی ہوئی ہے کہ اس سے نکلنے کی ہر وقت فکر کرتے رہو جیسے کوئی پاخانہ میں بیٹھا ہوا ہو اور تقاضا نکلنے کا رہتا ہے۔

ایک نیک قصہ

اس پر مجھے ایک حکایت یاد آئی کہ ایک ایس صاحب ریل میں بیٹھے ہوئے تھے اور کہیں جگہ نہ تھی مگر انھوں نے کئی آدمیوں کی جگہ گھیر رکھی تھی اور کوئی کچھ کہتا تو دھمکاتے۔ آخر ضرورت سے پانچانہ میں گئے تو چٹنی لگ گئی اور ان کے کھولنے

سے نہ کھلی پڑے پریشان ہوئے لوگوں سے التجا کی سب نے انکار کر دیا۔ آخر بڑی سماجت کے بعد لوگوں نے دوسروں کو تنگ نہ کرنے کی قسم کھلائی یہ بھی نہ دیکھا کہ یہ پانچانہ میں ہے اس میں قسم کھلانا جائز نہیں ہے تو جس طرح وہ پانچانہ سے نکلنے کی کوشش کر رہا تھا اسی طرح حرام نوکری میں ایسے ہی رہو کیا کوئی پانچانہ میں جا کر غر کرنا ہے۔ بلکہ قید سمجھتے ہیں مگر مجبوری میں کیا کریں۔ بس اس کی یہ حالت ہو گی۔

چونکہ برمیخت بہ بند و بستہ باش :- چوں کشاید چابک و جرستہ باش
تو نکلنے کی فکر کرو۔ کوشش تو کرو، گو کچھ امید نہ بھی ہو اسی کو
انسانی کوشش | فرماتے ہیں۔

گرچہ رخنہ نیست عالم را پدید :- خیرہ یوسف داری باید دودید
یوسف علیہ السلام کا قصہ ہوا کہ جب زلیخانے دروازہ بند اور قفل کر لیا اور آپ نکلنے کیلئے دوڑے ہیں۔ عجیب توکل اور ہمت تھی کہ باوجود قفل لگے رہنے کے دوڑے اور آخر قفل ٹوٹ کر سب دروازے کھل گئے۔ اس کو فرماتے ہیں۔

گرچہ رخنہ نیست عالم را پدید :- خیرہ یوسف داری باید دودید
اور اگر نہ بھی کھلے گا تو حق تعالیٰ یہ تو دیکھیں گے کہ یہ تو دوڑا مگر بھی لگ گئی اتنے پر بھی فضل ہو جاوے گا۔

اب بتلائیے اس میں کون سی چیز مشکل ہے میں تو نوکری نہیں چھڑاتا۔ مگر نفور رہیں۔ سو یہ کیا مشکل ہے اب تو یہ بھی نہیں بلکہ معصیت پر ناز ہے۔ بیباکی ہے۔ سو یہ فخر کیسا۔ اور تکبر کیسا۔ اور اہل دین کو ذلیل کیوں کہا جاتا ہے۔ سوال اسباب کا علماء کے ساتھ بڑا اختلاف معاش کے باب میں تھا۔ مگر اس سے زیادہ معاش کے متعلق کیا گنجائش ہو سکتی ہے۔

تو اب کوں نامرتبہ اختلاف کا رہ گیا اثر قانون تو دشوائے نہیں اور قانون سخت نہیں۔ صرف بات یہ تھی کہ لوگوں کی طرف سے دشواری ہو جاتی ہے۔ تو اس میں بہت بڑی فہرست اصلاح کی تو معاش میں نخل ہی نہیں اور جو نخل ہے اس کا بڑا حصہ تدبیر سے جائز ہو سکتا ہے اور جو تدبیر سے بھی جائز نہ ہو سکے وہ اولاً بہت مختصر ثانیاً اس میں اس طرح رہنے کی اجازت کہ اس سے نکلنے کی کوشش اور کئے پر پھٹنا اور توبہ کرتے رہنا تو اب وہ کون سا جزو ہے جس پر یہ اشکال ہے کہ شریعت کی پابندی بہت سخت ہے۔ تو بحمد اللہ بے غبار یہ ثابت ہو گیا کہ وہا جعل اللہ علیکم

فی الدین من مخرج، (لا ریبہ) (لفی المخرج ص ۱۵)

۱۴) ہر بات کی دلیل قرآن شریف سے طلب کرنا غلطی ہے

دلائل شرعیہ چار ہیں۔ کتاب، سنت، اجماع، قیاس۔ جو امران دلائل چار گانہ میں سے کسی ایک سے بھی ثابت ہو وہ دین میں معتبر ہوگا ورنہ رد ہے۔ پس یہ بھی غلطی ہوگی کہ ان چاروں سے حجاجہ کیا جاوے۔

ایک عام غلطی آج کل ایک عام غلطی یہ بھی ہو رہی ہے کہ لوگ یہ چاہتے ہیں کہ مسئلے کو قرآن شریف سے ثابت کریں، حالانکہ دلائل شریعت کے چار ہیں اگر ان میں سے ایک سے بھی کوئی مسئلہ ثابت ہو جائے گا تو وہ شرعاً ثابت ہو جائے گا۔ چنانچہ ڈاڑھی رکھنے کی نسبت بعضہ کہتے ہیں کہ قرآن شریف سے دلیل لاؤ کہ ڈاڑھی رکھنا فرض ہے۔ اور یہ دلائل کا مطالبہ کرنے والے ایسے حضرات ہیں کہ جن کو خود تحقیق و استدلال ہی سے اصلاً مس نہیں ان کو تو چاہئے تھا کہ محض تقلید کرتے۔ علامہ کی۔ قاعدہ عقلی ہے کہ جس فن کا جو جاننے والا ہوتا ہے وہی اس میں دخل دے سکتا ہے اور نہ جاننے والا اگر دخل دے تو اس کو سب ہنستے ہیں۔ یہ قاعدہ ہر جگہ تو جاری کرتے ہیں لیکن دین کے اندر ہر شخص مجتہد ہونے کا مدعی ہے اور ہر کس و ناکس اس میں دخل دینے کے لئے تیار ہے۔ فن ذراعت کو مثلاً میں نہیں جانتا۔ تو اگر میں گیسوں بونے کا طریقہ بیان کروں تو جاننے والے یہ کہیں گے کہ تم کیا جانتے۔ اور تمام عقلا کے نزدیک جواب کا فی سمجھا جائے گا مگر حیرت ہے کہ دین کے بارے میں اگر علماء بعینہ یہی جواب دیتے ہیں تو ناکافی شمار ہوتا ہے۔

ایک مثال یاد رکھو فن کے جاننے والوں کے سامنے تمہارے مطالبہ دلائل کی ایسی مثال ہے کہ ایک شخص کے پاس گھڑی ہے اور وہ بڑی معتبر ہے۔ تار گھر سے ملی ہوئی ہے اور ایک شخص قباب کی طرف رخ کئے ہوئے کھڑا ہے۔ گھڑی والا کہتا ہے کہ گھڑی کے اعتبار سے آفتاب چھپ گیا اور اس میں ہرگز غلطی کا احتمال نہیں۔ دوسرا شخص کو دیکھنے والا کہتا ہے کہ آفتاب

میرے سامنے ہے چھپا نہیں اور گھڑی والا اس سے دلیل طلب کرتا ہے اور وہ ہنستا ہے کہ یہ تو کھلی بات ہے۔ آفتاب نظر کے سامنے ہے تم اس طرف منہ کر کے دیکھو۔ آفتاب موجود ہے۔ دلیل کی حاجت نہیں ہے۔

پس جن لوگوں نے دین کے باب میں اپنی عمریں کھپا دی ہیں ان کا قول معتبر ہوگا یا ایک لڑکے کا جو آج ہی بالغ ہوا ہے۔ لیکن دین کا بالغ نہیں ہے۔ مولانا فرماتے ہیں کہ خلق اطفال اند جز مست خدا۔ نیست بالغ جز ہمدہ از ہوا بہر حال حسیا بالغ ہو یا نہ ہو، روحاً بالغ نہیں ہے۔ بلکہ حسیاً بھی ہم کو تو ایسے لوگ بالغ نہیں معلوم ہوتے اس لئے کہ ظاہری علامت بلوغ کی ڈاڑھی تھی اور وہی صفا چٹ ہے۔ معلوم بھی نہیں ہوتی کہ نکلی ہے یا نہیں۔

شریعت کے دلائل بہر حال ایسے لوگ جن کی یہ حالت ہے کہ علوم دین کی ان کو ہوا تک نہیں لگی وہ دلائل کا مطالبہ کرتے ہیں کہ قرآن شریف سے دلیل لاؤ۔ میں کہتا ہوں کہ اس سوال کے اندر ایک عوی مضمر ہے۔ اور وہ یہ ہے کہ وہ اس کے مدعی ہیں کہ شریعت میں قرآن شریف کے سوا کوئی دلیل نہیں ہے۔ ہم اس دعویٰ پر اول ان سے دلیل کا مطالبہ کرتے ہیں ہم کو یہ سمجھا دو کہ شریعت میں قرآن شریف ہی دلیل ہے اور کوئی دلیل نہیں۔ خود قرآن شریف سے ثابت ہے کہ علاوہ قرآن شریف کے اور بھی دلائل ہیں۔ فرماتے ہیں۔ دَعَا أَتٰكُمُ الرَّسُوْلُ فَاٰتُوْهُ دَعَا نَهٰكُمُ عَنْهُ فَاَنْتَهُوْا۔ (جو رسول خدا تم کو دیں اسے لے لو اور جس سے روکیں ان سے روک جاؤ)

حدیث رسول اس سے صاف معلوم ہوا کہ جناب رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کا ارشاد اگرچہ وہ قرآن نہ ہو مثل قرآن شریف کے حجت ہے اور کیوں نہ ہو دما ینطق عن الہوی آپ کی شان ہے۔

اجماع امت گفتہ اد گفتہ اللہ بود۔ گرچہ از حلقوم عقبہ اللہ بود اور فرماتے ہیں وَمَنْ يُشَاقِقِ الرَّسُوْلَ مِنْۢ بَعْدِ مَا تَبَيَّنَ لَهُ الْهُدٰی وَيَتَّبِعْ غَيْرَ سَبِيْلِ الْمُؤْمِنِيْنَ تُوَلِّهِ مَا تُوَلِّیْ وَنُصْلِهِ جَهَنَّمَ۔ اس آیت شریف سے اجماع امت کا حجت ہونا معلوم ہوا۔

اور فرماتے ہیں دَعُوْا إِلَى التَّوْحِيدِ وَإِلَى أَوَّلِي الْأَمْرِ مِنْهُمْ لَعَلَّهُمْ الْبَازِغُونَ
يَسْتَنْبِطُوْهُ مِنْهُمْ

قیاس

اور فرماتے ہیں نَاعْتَبِرُوا أَوَّلِي الْأَبْصَارِ، یہ آیتیں بتلا رہی ہیں کہ قیاس بھی حجت ہے۔ پس اگر آپ قرآن شریف کو حجت مطلقہ مانتے ہیں تو اس کی کیا وجہ ہے کہ اس کے بعض عادی مسموع اور حجت اور بعض نامسموع۔ غرض یہ سخت غلطی ہے۔ دیکھئے عدالت میں دعویٰ کی سماعت کے لئے شہادت مطلقہ کی ضرورت ہے۔ مدعی اگر دو با دجاہت آدمیوں کو پیش کر دے تو مدعا علیہ یہ نہیں کہہ سکتا کہ فلاں حج صاحب اور فلاں مولوی صاحب گواہی دیں گے تو مانوں گا اور اگر وہ ایسا کہے تو حاکم ہرگز نہ سنے گا۔ اور یہ کہے گا کہ تم ان گواہوں جرح کرو۔ تو اس کی طرف التفات ہوگا لیکن اگر یہ جرح نہیں تو تمہاری یہ تخصیص کہ فلاں فلاں اشخاص گواہی دیں ایک نوبات ہوگی۔

اسی طرح مسئلہ عقلیہ ہے کہ دعویٰ کے اثبات کے لئے مطلق دلیل صحیح کی ضرورت ہے مستدل جس دلیل کو چاہے اختیار کرے مخاطب کو یہ اختیار ہے کہ اس میں جرح کرے۔ اس کا جواب بذمہ مدعی ہوگا لیکن وہ یہ نہیں کہہ سکتا کہ تم نے یہ دلیل کیوں اختیار نہ کی۔ اسی طرح یہاں سمجھ لیجئے کہ کسی مسئلہ شرعی کے اثبات کیلئے مطلق دلیل صحیح کی ضرورت ہے جو ادلہ اربعہ میں سے ہو کسی خاص دلیل کا مطالبہ نہیں کیا جاسکتا البتہ اس کا لحاظ ضروری ہے کہ قطعی دعویٰ کیلئے قطعی دلیل اور ظنی دعویٰ کے لئے ظنی دلیل ہونا چاہئے جس کی تفصیل اپنے مقام پر مذکور ہے۔

غرض ایک تو غلطی یہ ہے اور دوسرے اس کے مقابل یہ ہے کہ ان چاروں سے گذر کر نرے ظن کو ہی حجت سمجھا جائے کہ نرا گمان بھی کسی مسئلہ کا مثبت نہیں ہے بلکہ دلیل صحیح ادلہ اربعہ میں سے ہونا ضروری ہے۔ (حصہ ششم دعوات عبدیت و عطا الفار المجاوزہ ص ۱۲)

آزادی کے معنی

(۱۵)

حضرت عمر رضی اللہ عنہ کا قصہ ہے کہ آپ رات کے وقت گشت لگا رہے تھے کہ ایک گھر سے گانے کی آواز آئی۔ آپ نے دروازہ کھلوانا چاہا مگر وہ لوگ اس قدر منہمک تھے کہ آپ کی آواز بھی نہ سن سکے آخر آپ مکان کی پشت پر سے اندر تشریف لے گئے۔ حضرت عمر

کی صورت دیکھ کر وہ سب لوگ سہم گئے لیکن چونکہ جانتے تھے کہ حضرت عمرؓ کو ہرگز غصہ نہ آئے گا اسلئے ایک شخص نے جرأت کر کے عرض کیا کہ اے امیر المومنین ہم لوگوں نے صرف ایک ہی گناہ کیا لیکن آپ نے تین گناہ کئے۔ ایک تو یہ کہ آپ بغیر اجازت ہمارے گھر میں چلے آئے حالانکہ قرآن شریف میں صاف حکم ہے۔ لَا تَدْخُلُوا بُيُوتًا غَيْرَ مَبْرُورَةٍ حَتَّى تَسْتَأْذِنُوا وَتَسَلِّمُوا عَلَى أَهْلِهَا۔ دوسرا یہ کہ آپ نے تجسس کیا اور قرآن شریف میں تجسس کی ممانعت ہے۔ لَا تَجَسَّسُوا۔ تیسرے یہ کہ آپ مکان کی پشت پر سے تشریف لائے حالانکہ قرآن شریف میں ارشاد ہے لَيْسَ الْبِرَّ بِأَنْ تَأْتُوا الْبُيُوتَ مِنْ ظُهُورِهَا۔ حضرت عمر رضی اللہ عنہ نے فرمایا کہ میں اپنے گناہ سے توبہ کرتا ہوں تم بھی اپنے گناہ سے توبہ کر لو۔

آزادی کا دم بھرنے والوں کو اس حکایت سے عبرت حاصل کرنی چاہئے کہ آزادی ان حضرات میں تھی یا آج کے مدعیان آزادی میں یہاں کی طرح نہ نماز کے نہ روزے کے۔ کھا لیا اور ہلایا سب میں عمر گزاری۔ صاحبو! اللہ یہ آزادی نہیں۔ یہ نفس کی شرارت اور اتباع ہوا اور مطلق العنانی ہے۔ یہ آزادی سانڈ کی سی آزادی ہے کہ جس کھیت میں چاہا نہ مار دیا جھڑ چاہا پھل دیا جو چاہا کر لیا۔ تو کیا کوئی آزاد صاحب سانڈ صاحب کو پسند کرتے ہیں۔ اگر اس کا جواب نعم ہے تو آج سے آپ بھی ہماری طرف سے ہی لقب لیجئے، اور اگر لا میں جواب ہے تو پھر ذرا ہیرانی کر کے اپنے اور سانڈ میں کچھ فرق بتائیے۔ (رئبان النفس ص ۱۸)

(۱۶) اس اعتراض کا جواب کہ علماء کو لیجر دینا نہیں آتا

اہل حق اور جدید طرز کے لوگوں کی تقریر میں جو فرق میں دیکھا وہ یہ ہے کہ جدید طرز کی تقریریں پہلی نظر میں نہایت دقیق اور مؤثر ہوتی ہیں اور حق انھیں میں منحصر معلوم ہوتا ہے لیکن جب ان میں غور کیا جائے تو انکی حقیقت کھلتی جاتی ہے اور ان کا لیجر اور کمزور اور خلاف واقع ہونا اور

لے گھروں میں داخل نہ ہو۔ جو تمہارا گھر نہیں۔ یہاں تک کہ اجازت حاصل کر لو اور گھر والوں کو سلام کر لو لے کسی کے پیچھے ٹوہن نہ پڑو۔ تب یہ نیکی نہیں ہے کہ تم گھروں میں اس کی پشت کی طرف سے آؤ۔ لے خواہشات نفس سے ہاں لے نہیں۔

پر تلمیح ہونا معلوم ہوتا جاتا ہے اور اہل حق کی تقریریں نظر اول میں بے رنگ اور پھیککی معلوم ہوتی ہیں۔ لیکن جتنا ان میں غور کیا جائے تو انکی قوت اور مطابق واقع ہونا معلوم ہو جاتا ہے اور قلب پر نہایت گہرا اثر ان کا ہوتا ہے کہ اس کے سامنے تمام تعلیمات قلب سے دھن جاتی ہیں۔ یہاں سے اس اعتراض کا جواب بھی نکل آیا جو آج کل کے علما پر مغلہ دوسرے اعتراضات کے وہ بھی کیا جاتا ہے کہ انکو کیچر دینا نہیں آتا وہ جواب یہ ہے کہ جب ہمارے پاس قرآن شریف اور حدیث شریف ہے اور اس کی تعلیمات کا سرمایہ موجود ہے تو ہم کو کسی ظاہری آب و تاب کی کیا ضرورت ہے، خوب کہا ہے

ز عشق تا تمام ما جمال یار مستغنی ست
باب درنگ خال و خطا چ حاجت روئے زیار

سادگی لیکن لکچروں کا طرز سیکھنے کی کوئی ضرورت نہیں۔ اور ہم تو صاف کہتے ہیں کہ جو شخص لکچر کے طرز کو اختیار کرتا ہے وہ اول ہمارے دل میں ناپسندیدگی کا بیج بوتا ہے ہم کو تو وہی طرز پسند ہے جس کی طرف حدیث شریف میں اشارہ ہے مخی امۃ امیتہ ائمہ کے معنی سادگی کے ہیں تو حضور صلی اللہ علیہ وسلم کی اصل مرضی یہ ہے کہ آپ کی امت نہایت سادہ رہے۔ اسی لئے آپ نے لفظ سخن فرما کر ساری امت کو شامل فرمایا۔ یہی روح ہے اتباع نبوی کی، کہ ہر بات میں بالکل سادگی ہو امیتہ ام کی طرف منسوب ہے مطلب یہ ہے کہ ہماری زندگی ایسی رہے جیسے ماں کے پیٹ سے پیدا ہونے کے بعد بچہ کی زندگی ہوتی ہے کہ اس کو کوئی حرکت بھی تصنع اور بناوٹ کی نہیں ہوتی بلکہ ہر حرکت میں بے ساختگی ہوتی ہے۔ اور بچوں کی یہی صفت ہے جس کی وجہ سے ہر شخص کو ان سے محبت ہوتی ہے ورنہ طبعاً بچوں سے جو کہ نجاست کی پوٹ ہوتے ہیں بہت نفرت ہونی چاہئے تھی اور یہی بے ساختگی ہے کہ جن بوڑھوں میں یہ پانی جاتی ہے آج ہماری آنکھوں کے سامنے بڑے بڑے حسین ان پر جان فدا کرتے ہیں۔ تو اصلی مفہوم امیتہ کا یہی بے ساختگی ہے اور نہ لکھنا پڑھنا جو امیت کا مشہور مفہوم ہے یہ بھی اس کا ایک شعبہ ہے۔

تو بیان میں بھی بناوٹ اور تکلف بالکل نہ ہونا چاہئے اور تبلیس اور تلمیح سے بالکل پاک ہونا چاہئے۔ البتہ بیان

میں سادگی کے ساتھ صفائی ہونی ضروری ہے۔ لیکن اب یہ طرز بالکل چھوٹا جاتا ہے ہم اہل علم کو دیکھتے ہیں کہ ان میں ایک تو رواج زبان کا طرز آ جاتا ہے۔ حالانکہ قطع نظر شریعت کے یہ بھی دیکھنا چاہئے کہ ہماری مادری زبان اردو ہے اور اس میں کچھ خصوصیات ہیں جیسا کہ ہر زبان کے لئے کچھ خصوصیات ہوا کرتی ہیں۔ اب اس طرز جدید کو اختیار کر کے انگریزی کی خصوصیات کو زبان اردو میں لے لیا گیا ہے اور وہ روز بروز زیادتی کے ساتھ آتی جاتی ہیں حالانکہ انگریزی کی خصوصیات اس میں بالکل نہیں کھپتی۔

اردو زبان کی خصوصیت ان کی بدولت زبان بالکل بھٹی اور خراب ہوتی جاتی ہے۔ ایسے لوگوں میں اس وقت ایک بڑی جماعت اپنے کو اردو کا حامی کہتی ہے۔ حالانکہ اگر غور سے دیکھا جائے تو وہ لوگ اردو کے حامی نہیں کیونکہ ہر زبان میں ایک مادہ ہوتا ہے اور ہیئت۔ اور زبان ان دونوں کے مجموعے کا نام ہوتا ہے دیکھ صرف مادہ کا۔ تو زبان اردو کی ہیئت باقی نہ رہے گی تو وہ زبان اردو کیونکر رہے گی پس اگر ہم اردو کے حامی ہیں تو ہم کو چاہئے کہ ہم اس کی خصوصیات کو باقی رکھیں۔ اور ہماری گفتگو ایسی ہو کہ اگر کوئی اجنبی سنے تو یہ سمجھے کہ ہم ایک حرف بھی انگریزی کا نہیں جانتے اور نہ انگریزی طرز سے ہم کو مناسبت ہے اور اس سے بھی بڑا تعجب یہ ہے کہ اس وقت عربی طلبہ کی تقریروں میں کثرت سے انگریزی الفاظ آنے لگے ہیں حالانکہ ان کی تقریر میں اگر دوسری زبان کے الفاظ آتے تو عربی کے الفاظ آتے۔ کیونکہ اول تو یہ لوگ عربی زبان کی تعلیم حاصل کرتے ہیں۔ دوسرے عربی ہماری مذہبی زبان ہے اور اس اعتبار سے ان کی اصلی زبان وہی ہے اور اردو زبان تو بہت تھوڑے دنوں سے ہماری زبان ہوئی ہے ورنہ ہماری اصلی زبان اور پیری زبان عربی ہی ہے کیونکہ ہمارے آباء و اجداد عرب ہی سے آئے ہیں اور ہندوستان میں بودو باشس اختیار کر لی ہے۔

اصل اردو غرض جب ہماری اصلی زبان عربی ہے تو اگر ہم کو اردو میں آمیزش ہی کرنا تھا تو اس بنا پر زیادہ سے زیادہ ہم یہ کرتے کہ اردو زبان کو عربی کے تابع کر دیے۔ مگر تعجب یہ ہے کہ ہم نے انگریزی کے تابع کیا کہ جس کی بدولت اردو زبان قریب قریب اردو ہونے ہی سے نکل گئی۔ اصل زبان اردو وہ ہے جیسے چار درویش یا اردو معنی غالب کی۔ اگر اس میں آمیزش ہو تو عربی کی آمیزش ہونا چاہئے۔ کہ عربی کی آمیزش لطف کو

دوبالا کر دیتی ہے۔ دیکھو فارسی کی عبارت میں اگر کہیں ایک جملہ عربی کا آجاتا ہے تو یوں معلوم ہوتا ہے جیسے گلفشانی ہوگئی ہو۔

خلاصہ یہ ہے کہ ہماری زبان میں جو انگریزی کے غلط سے ایک جدت پیدا ہوگئی ہے وہ ضرور قابل ترک ہے اور اس جدید طرز میں علاوہ نقص مذکور کے ایک بڑا عیب یہ بھی ہے کہ تلبیس زیادہ ہو سکتی ہے اور پرانے طرز میں یہ بات نہیں ہے۔ اور ایک شرعی پہلو اس میں یہ بھی ہے کہ اس کو اختیار کرنا ایک فاسق قوم کے مشابہ ہے اور یہ مشابہت خود حرام ہے حدیث میں ہے۔ من تشبہ بقوم فهو منهم کیونکہ تشبہ عام ہے لباس اور طرز سب چیزوں کا اور لوگوں نے اس پر کوئی شخص مولویوں کو متعصب کہے لیکن ہم کو اس کی اصلاح دانا نہیں کیونکہ ہم ایک موقع پر ان کے مسلم دلائل سے اس کا برا ہونا ثابت کر چکے ہیں۔ باقی حدیث تو اپنے ماننے والوں کے لئے پڑھی ہے اب میں ترقی کر کے کہتا ہوں کہ حدیث آپ پر بھی حجت ہے کیونکہ مسلمان تو آپ بھی ہیں۔

غرض اس وقت تقریرات میں تمام خرابیاں پیدا کی گئی ہیں جن سے بسبب قواعد شرعیہ کے چھوڑ دینے کے ان تقریروں کا وجود کا عدم سمجھا جائے گا۔ پس ثابت ہو گیا کہ جس طرح بیان کا وجود حسی موقوف ہے خلق انسان پر اسی طرح اس کا وجود شرعی موقوف ہے تعلیم قرآن پر اور یہی حاصل ہے ان آیات کا اور چونکہ تقاریر میں آج کل یہ نقص عام طور سے پیدا ہو گیا ہے۔ اس لئے یہ جی بھی چاہتا تھا کہ طریقہ بیان کے متعلق ایسی آیت اختیار کی جائے کہ قرآن شریف ہی سے اس کی خرابیوں کا ناجائز ہونا بھی ثابت ہو جاوے۔ سو بحمد اللہ یہ آیت الرحمن، علم القرآن خلق الانسان، علمہ البیان، کہ اس میں تعلیم بیان کی شرط شرعی بھی مذکور ہے کہ قرآن شریف سکھایا۔ کیونکہ غایت اس کی عمل ہے اور بیان اگر حدود شرعی کا لحاظ رہا تو قرآن پر عمل نہ ہوا کیونکہ عمل بالقرآن کے فوت ہونے کے معنی یہی شریعت کا فوت ہونا ہے (تعلیم البیان ص ۱)

لے جس نے کسی قوم کی مشابہت اختیار کی تو وہ اسی میں کا ہو گیا۔

(۱۷) ہم لوگ تہذیب میں دوسری قوموں کے

محتاج نہیں ہیں

بعض لوگوں کا یہ بھی خیال ہے کہ ہم تہذیب میں دوسری قوموں کے محتاج ہیں اور غربت اسلام کو تہذیب سے معزاً سمجھتے ہیں۔ ان لوگوں کی بالکل ایسی مثال ہے جیسے کہ ایک ایک چشم کی نسبت مشہور ہے کہ وہ دہلی میں گیا سیر کیلئے چاندنی چوک میں نکلا۔ اتفاق سے آپ کی گردن بھی نہر سکئی تھی اسلئے جاتے وقت صرف ایک طرف کی دوکانیں نظر آئیں۔ دوسرے جانب کی نظر نہ آئیں۔ جب وہاں سے واپس ہونے لگا تو دوسری جانب کی دوکانیں نظر آئیں۔ انکو دیکھ کر آپ فرماتے ہیں کہ دلی کے لوگ بھی کیا تم کے لوگ ہیں۔ ابھی یہ دوکانیں دائیں جانب تھیں ابھی ہمارے لوٹنے سے پہلے ان کو بائیں جانب اٹھا کر رکھ دیا۔

تو ہمارے بھائیوں نے بھی شریعت کو صرف ایک طرف سے دیکھا اسلئے وہ محتاج سمجھتے ہیں ورنہ شریعت اسلام میں وہ تہذیب ہے کہ دنیا میں کسی قوم کے اندر بھی اتنی تہذیب نہیں ہے چند روز اگر ہمارے پاس رہو اور پھر دیکھو کہ وہ شریعت جس کو آج خوشنوار بتلایا جا رہا ہے۔ وہ کیسی دلفریب ہے۔ جب اس کی حقیقت سے واقف ہو گئے تو اس پر عاشق ہو جاؤ گے اور یہ کہو گے کہ

زفرن تا بقدم ہر کجا کہ می نگرم
کہ مشہ دامن دل میکشد کہ جای نجاست

کہ سر سے پیر تک جہاں نظر کر ددل کھنچا چلا جاتا ہے۔ (مفاز المعیشت ص ۱۱)

(۱۸) حضور صلی اللہ علیہ وسلم امریکہ تشریف نہیں لیگے

تو پھر حضور کی بعثت عالم کیسے ہوئی؟

ایک صاحب نے ایک مرتبہ یہ سوال کیا کہ یہ تو میرا اعتقاد ہے کہ جناب رسول کریم صلی اللہ علیہ وسلم کی

بعثت عام ہے۔ لیکن یہ ظہان ہوتا ہے کہ امریکہ میں نہ تو حضور صلی اللہ علیہ وسلم تشریف لے گئے اور نہ صحابہ کرام رضی اللہ عنہم میں سے کسی کو حضور صلی اللہ علیہ وسلم نے وہاں بھیجا کیونکہ اگر ایسا ہوتا تو ضرور کہیں ایسا منقول ہوتا حالانکہ منقول نہیں۔ نیز امریکہ کا حال بہت بعد میں معلوم ہوا ہے کہ ایک جہاز غلط رستے پر ہولیا تھا اور وہ وہاں پہنچ گیا۔ اور اس کو معلوم ہوا کہ یہاں بھی کچھ لوگ رہتے ہیں۔

جب وہاں آپ کی دعوت نہیں پہنچی تو نبوت عام کیسے ہوئی جواب میں فرمایا کہ بعثت عامہ کے معنی سمجھنے میں غلطی ہوئی۔ بعثت کے عام ہونے کے معنی یہ ہیں کہ جب کبھی جس کسی کو حضور صلی اللہ علیہ وسلم کی بعثت کی خبر پہنچی اور وہ آپ پر ایمان نہ لائے اور احکام قبول نہ کرے تو وہ کافر ہے اور یعنی نہیں کہ حضور صلی اللہ علیہ وسلم کے زمانہ میں حضور کی بعثت کی خبر ساری دنیا کو ہو گئی تھی۔

اس تقریر کے بعد اب کوئی شبہ نہیں ہے۔ پس امریکہ میں جس وقت خبر پہنچی اسی وقت سے وہاں کے لوگ مکلف ہوں گے (مجاہدلت معدلت و دعوات عبدیت حصہ پنجم ملفوظ ۲۱)

(۱۹) جب انسان کی تقدیر میں یہ لکھ دیا گیا کہ وہ

فلاں گناہ کرے گا تو پھر انسان مجرم کیوں؟

فرمایا کہ یہ مجبوری عمل کے بعد معلوم ہوتی ہے یعنی جب گناہ کر چکا اس وقت خبر ہوئی کہ یہ گناہ میری قسمت میں لکھا ہوا تھا۔ اس کے قبل جب گناہ کیا ہے تو اس کی خبر نہ تھی۔ اور اگر کہا جاتا کہ گناہ کو علم تقدیر کا نہ تھا مگر واقع میں تو علم الہی اس کے متعلق تھا اور اس کا خلاف محال ہے تو اس طرح واقع میں مجبور ہوا۔

اب جواب یہ ہے کہ علم الہی اس طرح تھا کہ یہ شخص اپنے اختیار سے ایسا کرے گا تو اختیار منفعی ہوا۔ یا اور مؤکد ہو گیا۔ پھر سوال کیا گیا کہ اگرچہ انسان کا مجبور ہو نا لازم نہیں آتا لیکن خداے تعالیٰ رحیم ہیں اس لئے اگر اپنی رحمت سے ہوائے نفسانی کو پیدا ہی نہ کرتے۔ تو انسان کے لئے بہتر ہوتا۔ اس پر فرمایا کہ خدا تعالیٰ کی متعدد صفات ہیں، ازاں جلد ایک صفت حکیم ہونا

بھی ہے اور ہر صفت کا ایک خاص ظہور ہے پس جس طرح ہوائے نفسانی وغیرہ کا پیدا ہونا مقضیٰ رحمت ہے اسی طرح ان کا پیدا ہونا مقضیٰ حکمت ہے۔

رہا سوال کہ وہ کیا حکمت ہے؟ اس کا اصل جواب یہ ہے کہ ہم کو اس حکمت کی اطلاع نہیں ہے۔ اور فرمایا کہ یہ جواب کم انہوں کے نزدیک زبردستی کا جواب معلوم ہوتا ہے لیکن اصل جواب یہی ہے۔ البتہ اس جواب کی حقیقت سمجھنے کے لئے اس کے قبل چند مقدمات سمجھنے کی ضرورت ہے جب تک کہ وہ سمجھ میں نہ آئیں اس وقت تک اس کی حقیقت سمجھنی مشکل ہے اور اس وقت تک یہ زبردستی کا جواب نظر آتا ہے۔

پھر فرمایا کہ جب انسان کے ہر عمل میں اختیار کا سلسلہ امور غیر اختیاریہ تک پہنچتا ہے جس سے اہل سائنس بھی انکار نہیں کرتے اور بنا بر تقدیر یہی امر ہے جیسا اوپر بیان ہوا تو اہل طبعیات کو تو تقدیر کا ضرور ہی قائل ہونا چاہئے کیونکہ وہ لوگ اس مسئلہ انتہار الاختیاری غیر الاختیار کو اس حد تک مانتے ہیں کہ خدا تعالیٰ کے افعال اختیاری کو بھی اس قاعدہ کا پابند کرتے ہیں۔ چنانچہ تخلیق اختیاری کو موقوف مانتے ہیں۔ وجود مادہ قدیمہ پر جس کو اختیار خداوندی سے خارج کہتے ہیں۔ گو اہل حق اس کے قائل نہیں پس اس تسلیم کردہ مسئلہ کی بنا پر ان طبعیین کو تو ہم سے زیادہ قائل تقدیر ہونا چاہئے۔

(مجاہدلت معدلت، دعوات عبدیت حصہ دوم ملفوظ ۲۲)

(۲۰) اللہ تعالیٰ نے مسلمانوں سے سلطنت چھین کر کفار کو کس لئے دیدی

فرمایا کہ جو چیز نہایت صاف شفاف ہو اس پر دھبہ ہونا نہایت ناگوار ہوتا ہے اور جو چیز خود سیلی ہو اس پر ناگوار نہیں ہوتا جیسے ٹوپی چھینٹ لگ جانے سے اتار کر پھینک دیتے ہیں اور جوتے میں لگ جانے سے کوئی ناگواری نہیں ہوتی۔ ایسے ہی مسلمان دعویٰ محبت کرتے ہیں۔ ان سے ذرا سی بے احتیاطی ناگوار ہوتی ہے بخلاف اعداء کے کہ وہ جیتے بھی لے دشمن

لیں گے وہ ترقی نہیں کریں گے بلکہ جو دیں گے وہ تباہ ہوں گے پس یہ طریقہ ترقی کا نہیں ہو سکتا ترقی کا صریح طریقہ خوش معاملگی اور اعتبار ہے۔ مسلمانوں میں خدا کے فضل سے افلاس نہیں۔ مسلمانوں میں ساجر، اہل ملک، رئیس سب طرح کی مخلوق ہے مگر بات کیا ہے کہ دوسری قوموں کو سود دیتے ہیں۔ اس وجہ سے تباہی آتی ہے۔ تو ایسی صورت ہونی چاہئے کہ سود نہ دینا پڑے اور وہ طریقہ صرف خوش معاملگی ہے۔

بد معاملگی کا انجام تفصیل اس اجمال کی یہ ہے کہ مسلمانوں کو روپے کی ضرورت ہوتی ہے اور اپنے بھائیوں سے بلا سودی ملتا نہیں اس لئے غیر قوم سے سودی قرض لینے کی ضرورت ہوتی ہے اور تباہ ہوتے ہیں۔ اور بے سود قرض نہ ملنے کی وجہ یہ نہیں ہے کہ دوسرے مسلمانوں کے پاس روپیہ نہیں ہے۔ ابھی میں عرض کر چکاں کہ مسلمانوں میں بہت مالدار ہیں۔ لیکن وہ بوجہ خوف بد معاملگی کے قرض نہیں دیتے۔ بہت لوگ ایسے ہیں کہ خود چاہتے ہیں کہ ہم مسلمانوں کی امداد کریں اور انکو قرض دیں مگر ڈرتے ہیں کہ دیکر کیا لیں گے اگر خوش معاملگی مسلمانوں میں شائع ہو جائے تو خود آپس ہی ہیں ایک دوسرے کی حاجت پوری ہوتی رہے اور سود دینے کی ضرورت نہ پڑے تو جو تباہی کا سبب ہے رفع ہو جائے۔

پس ثابت ہوا کہ بد معاملگی تنزل کا سبب ہے۔ ہم لوگوں کی یہ حالت ہے کہ کسی کا روپیہ لیکر دینا نہیں چاہتے۔ حتیٰ کہ اگر کسی غریب کے چار پیسے ہوں گے تو وہ بھی ٹال کر دیں گے اور اس کو لازمہ ریاست سمجھتے ہیں کہ ہم سے تقاضہ کرنے کی مجال نہ ہوئی۔ اسی طرح قرض خواہ کو نہ دیں گے اور بہانہ کر دیں گے کہ بھائی ابھی خرچ نہیں آیا۔ اور اسی حالت میں اگر بچہ کی ہفتہ درپیش ہو جائے یا کوئی شادی کرنا ہو تو بہتر راہ روپیہ اگل دیں گے غرض بد معاملگی کا مرض عام ہے۔

(تعلیم الشرائع ص ۱۱)

کیا تمام علما قرآن شریف میں ہیں (۲۲)

بعض لوگ کہتے ہیں کہ تمام علما قرآن شریف میں ہیں۔ چنانچہ ایک شخص نے مجھ سے کہا کہ ڈاکٹروں نے تحقیق کر لیا کہ مادہ منویہ میں کیڑے ہوتے ہیں۔ سو قرآن مجید میں بھی یہ مسئلہ مذکور ہے اس لئے کہ فرمایا ہے خَلَقَ الْإِنْسَانَ مِنْ عَلَقٍ،

اصول پر عمل کر لیں تو اللہ میاں ان کو دیدیتے ہیں اگرچہ وہ اللہ تعالیٰ کے دشمن ہی ہیں۔
(مجادلات معطل حصہ سوم دعواتِ مجددیت محفوظ ص ۲)

اس اعتراض کا جواب کہ سود کے بند کر دینے سے ہماری قوم پر تباہی آگئی

عقلاً و وقت اس میں مختلف ہیں کہ تباہی قوم کا کیا سبب ہے میرے نزدیک تو اصل سبب تباہی کا بد معاملگی ہے۔ بعض قوم کے ریفارمر کہتے ہیں کہ سود کے بند کرنے سے تباہی آئی۔ جو قومیں سود لیتی ہیں وہ خوب ترقی کرتی ہیں۔ میں کہتا ہوں کہ مسلمانوں میں بھی بہت سے سود لیتے ہیں۔ لیکن ان کے کچھ بھی کام نہیں آتا۔ کیوں کہ مال سے مقصود جمع و بقی ہے۔ اور سود خوار جمع کرتے کرتے مرجاتے ہیں اور بسا اوقات جن کے لئے جمع کرتے ہیں انکو بھی نہیں ملتا ہے اور فرض کر دے اگر مجتمع بھی ہوئے تو روحانی ضرر سے تو خالی رہتے ہی نہیں یعنی سخت دل ہو جاتے ہیں۔ کسی پر انکو رحم نہیں آتا کسی کی مصیبت سے ان کا دل نہیں دکھتا اور اپنے رشتہ دار سے بھی سود نہیں چھوڑتے۔ جیسے بیسٹروں کا حال ہے کہ وہ اپنوں کو بھی نہیں چھوڑتے سمجھتے ہیں کہ اگر ان سے نہ لیا تو نرخ بکڑ جائے گا۔ اور اکثر سود خواروں کو ترقی دینی بھی نہیں ہوتی۔ اکثر سود خواروں کا مال ضائع ہوتے ہی دیکھا ہے۔ اور فرض کر دے اگر ترقی بھی ہوئی تو جب دین برباد ہوا تو اس ترقی کو لیکر کیا کریں گے

مباد اول آں فرد مایہ شاد
کہ از بہر دنیا دہد دیں بباد
یہ تو دینی غلطی تھی کہ سود کو ترقی کا سبب قرار دیا۔
دوسرے ایک دنیاوی غلطی بھی ہے وہ یہ ہے
کہ ترقی کا سبب وہ شئی ہو سکتی ہے جس سے عام لوگ منتفع ہوں۔ اس لئے کہ ترقی یافتہ وہی قوم ہوگی جس کے سب افراد کو ترقی ہو اور عام طور سے ان میں غنی پیدا ہوں اور سودی لاشے ہے کہ ساری قوم میں شائع نہیں ہو سکتا۔ اول تو سب کے پاس مال نہیں۔ دوسرے آخر لے گا کون۔ اس لئے کہ محال بعض لیں گے اور بعض نہیں۔ تو جو لیں گے وہ تو ترقی کریں گے اور جو نہیں

اور علق کے معنی چونک کے ہیں۔ حالانکہ یہاں علق کے یہ معنی نہیں ہیں بلکہ خون بستہ کے ہیں اور برستی ان تحقیق کو قرآن شریف کا مدلول بناتے ہیں۔

ایک اور سائنس دان کہتے تھے کہ جیسے حیوانات میں نرمادہ ہیں اسی طرح نباتات میں بھی ہیں اور قرآن شریف میں اس کا بھی ذکر ہے خلق الانما داج کلھا اس عقلمند نے ازدواج کا ترجمہ میاں بیوی سے کیا حالانکہ زوج کے یہاں یہ معنی نہیں ہے بلکہ معنی اصفافے صاحبو! یہ طریقہ جو اختیار کیا گیا ہے یہ سخت مضر ہے۔

درستی بے خرد چوں دشمنی ست

اس میں بڑی دشمنی ہے اسلام کے ساتھ
ہر تحقیق کی جستجو قرآن میں درست نہیں

کے مسائل منفع نہیں ہوئے اور اس کو اہل سائنس بھی مانتے ہیں کہ ہم کو اب تک اس دریا کا قطرہ بھی حاصل نہیں ہوا پس جب کہ مسائل منفع نہیں ہوئے تو اگر آج آپ نے کسی جدید تحقیق کو قرآن شریف کا مدلول بنایا مثلاً یہی کہ تخم درخت میں نرمادہ ہوتے ہیں اور سو برس بعد یہ تحقیق غلط ثابت ہو گئی اور دوسری تحقیق نئی ہوئی تو اس میں تکذیب کلام الہی کی بھی لازم آئے گی پس یہ لوگ یصلون عن سبیل اللہ کے مصداق بن رہے ہیں غرض یہ کوشش کرنا کہ سب چیز قرآن شریف سے ثابت ہو سخت حماقت ہے۔ بلکہ قرآن شریف کا کمال یہ ہے کہ جس فن کی وہ کتاب ہے وہ فن اس میں ہو اور دیگر خرافات سے خالی ہو۔ قرآن شریف ایک طب روحانی ہے اور اس فن میں وہ لکھا ہے اور موٹی بات ہے۔ کہ جب مسائل دینیہ فرعیہ بھی سب کے سب قرآن شریف میں نہیں ہیں۔ تو فنون و تجربے کے مسائل تو اس میں کل کیسے ہوں گے۔ (اطاعت الاحکام ص ۷۱)

(۲۳) اس شبہ کا جواب کہ زکوٰۃ دینے سے مال کم

ہوتا ہے بڑھتا کہاں ہے

بعض لوگ کہتے ہیں کہ ہم تو گن کر روپے رکھتے ہیں اور زکوٰۃ دینے کے بعد پھر گنتے ہیں تو کم ہو جاتے ہیں۔ بڑھنا تو درکنار برابر بھی نہیں رہتے۔ بات یہ ہے کہ بڑھنے کی حقیقت

اور غرض پر اگر نظر ہوتی تو یہ شبہ نہ ہوتا مال کے بڑھنے سے غرض یہ ہے کہ وہ بڑھتا ہوا مال اپنے کام آئے۔ چنانچہ اگر کسی کے پاس کروڑوں روپیہ ہو۔ اور اس کے کام نہ آئے بلکہ فضولیات میں ضائع ہو جائے۔ اور ایک شخص کے پاس دس روپے ہوں لیکن دس کے دس اس کے کام آئے یہ شخص اس سے بدرجہا بڑھ کر ہے۔ سو ہم کھلی آنکھوں مشاہدہ کرتے ہیں کہ وہ شخص ہیں اور ان کی برابر آمدنی ہے مگر فرق اتنا ہے کہ ایک زکوٰۃ دیتا ہے اور تمام حقوق واجباد ادا کرتا ہے۔ سو اس کی چین و آرام سے زندگی گذرتی ہے۔ اور دوسرا شخص جو حقوق ادا نہیں کرتا وہ ہمیشہ پریشانی میں رہتا ہے۔ آج چوری ہو گئی کل کوئی مقدمہ قائم ہو گیا۔ خود بیمار ہو گئے، بچے بیمار ہو گئے۔ عطار کے یہاں روپیہ جارہا ہے۔ طبیب کی فیس میں روپیہ خرچ ہو رہا ہے۔ بخلاف پہلے شخص کے کہ جس قدر آمدنی ہے وہ سب اس کے کام آ رہی ہے جو مال بڑھنے سے غرض ہے وہ اس کا حاصل ہے۔

غرض اللہ تعالیٰ جس قدر لیتے ہیں اس سے زیادہ دیتے ہیں اور پھر جو لیتے ہیں وہ بھی ہمارے ہی لئے ہیں۔ (ذکر الموت ص ۹۸)

(۲۴) اس شبہ کا جواب کہ دیندار لوگ مصائب میں

زیادہ مبتلا رہتے ہیں

آپ کہیں کہ ہم تو کھلی آنکھوں دیکھتے ہیں کہ فرمانبرداروں کے زیادہ کام آ سکتے ہیں کوئی تنگدست ہے کوئی بیمار ہے، غرض فرمانبرداروں پر زیادہ مصائب آتے ہیں۔ جواب یہ ہے کہ کامیابی کی ایک تصویریت ہوتی ہے اور ایک اس کی حقیقت و روح ہوتی ہے مال اور صحت اور جاہ یہ کامیابی کی صورت ہے اور حقیقت اور روح اس کی راحت و جمعیت قلب ہے مال و جاہ اور صحت سب مقصود اطمینان اور راحت ہے۔ اگر سب کچھ ہو لیکن قلب پریشان ہو تو اس کو اہل دنیا بھی کامیابی شمار نہیں کرتے۔ چنانچہ اگر ایک شخص کے یہاں مال و دولت و شہرت و شوکت سب کچھ ہو اور اس کو پھانسی کا حکم ہو جائے اور اس کے مقابلہ میں ایک شخص فرض کیا جاوے کہ جس کے پاس ایک پیسہ نہیں ہے اور

مزدوری کر کے اطمینان کے ساتھ اپنا پیٹ پالتا ہے۔ اس سے اگر یہ کہا جاوے کہ فلا شخص کی تمام دولت تم کو ملے گی اگر بجائے اس کے تم پھانسی پر چڑھ جاؤ اور یہ اقرار کر لو کہ قاتل میں ہوں، وہ ہرگز منظور نہ کرے گا۔ اور کہے گا کہ میں دولت کو لے کر کیا چوٹھے میں ڈالوں گا جب میری جان ہی نہ ہوگی تو ایسی دولت کو کیا کروں گا اور اس دولت مند سے اگر پوچھا جائے کہ تم کو خلاص ہو جائے مگر اس شرط سے کہ اس کا فرقہ فاقہ تم کو ملے گا تو وہ خوشی سے راضی ہو جائے گا۔ معلوم ہوا کہ کامیابی کی حقیقت مال و جاہ و صحت نہیں ہے بلکہ حقیقت اس کی اطمینان اور راحت قلب ہے۔

اہل اللہ کا حال

پس ہم دعویٰ سے کہتے ہیں کہ اگر اہل اللہ پر فقر و فاقہ خواہ کسی قدر ہوں ان کا قلب پریشان نہیں ہوتا اور نافرمان کو کتنی ہی عیش و عشرت ہو لیکن اس کا قلب ہمیشہ پریشان ہے۔ خاص کر مسلمان کو تو نافرمانی میں آرام ملتا ہی نہیں کیونکہ اس کو دباؤ زبانی کا بھی کھٹکا لگا ہے۔ تو اس کا گناہ اور بھی بے لذت ہے۔ اب آپ کی سمجھ میں آگیا ہو گا کہ فرائض و عبادت سے روح کو عیش میسر ہوتی ہے ظاہری ناداری اور تنگ دستی اس کو پریشان نہیں کرتی ہے۔ کیا اگرچہ مفلس ہو لیکن وہ ہر وقت خوش ہے کہ جب چاہوں گا سونا بنا لوں گا۔ اس واسطے بڑے بڑے والیان ملک اور حکام وقت اس کے پیچھے پیچھے پھرتے ہیں۔

پس صابو! جب کہ وہ کیا جوتانے کو سونا بنا دیتی ہے یہ اثر رکھتی ہے تو حقیقی کیا یعنی حق تعالیٰ کی محبت اور اطاعت میں کیا یہ اثر نہ ہو گا۔ پس یہ خیال غلط ثابت ہوا کہ شریعت پر عمل کرنے سے کامیابی نہیں ہوتی اور یہ ثابت ہو گیا کہ حقیقی کامیابی اتباع شریعت میں ہی مضمر ہے۔ (شرط الایمان ص ۲۲)

ناول بینی کی مفرتیں

(۲۵)

اس میں اس قدر مشغولی ہوتی ہے کہ سوائے اس کے قلب میں کچھ نہیں ہوتا اگر کوئی کہے

کہ غفلت تو کچھ ہی میں کام کرنے اور ردی کھانے پکانے سب میں ہوتی ہے تو چاہئے کہ سب چھوڑ دیں۔

بات یہ ہے کہ کام دو قسم کے ہیں، ایک ضروری اور ایک غیر ضروری ضروری اشغال کا یوں تجربہ ہوا ہے کہ مضر نہیں ہے۔ اس لئے کہ اس کو ضروری سمجھ کر آدمی اس میں پھنستا ہے اور جب اس کو ضروری سمجھا تو اصلی کام دوسری شئی کو سمجھے گا تو دل اسی اصلی کام کی طرف رہے گا کہ اس کام سے فارغ ہو کر اپنا اصلی کام کریں گے۔ اور جو تھوڑی غفلت اس میں ہو جاتی ہے اس کیلئے استغفار کا حکم فرمایا ہے کہ استغفار سے وہ جمل دھلا جاوے گی۔ اور غیر ضروری کی نسبت یہ تو خیال ہے نہیں کہ یہ ضروری ہے اس لئے اس کو ہی مقصود سمجھے گا اور وہ مضر ہے اور مورث غفلت ہے، اور یہ غفلت بڑھتے بڑھتے معنی الی الکبائر بلکہ الی الکفر ہو جاتی ہے۔ بالخصوص ناول سے ایک بڑی سخت مرض پیدا ہوتا ہے وہ یہ کہ اس کے دیکھنے سے بد معاشی کے

ناول دیکھنا نقصان دہ ہے

طریقے خوب یاد ہو جاتے ہیں۔ ہمارے ناول کے شہیدانی پرانے قصوں پر اعتراض کرتے ہیں اور تاریکی اور خلاف تہذیب سمجھتے ہیں لیکن اس تاریکی اور اس روشنی میں اس قدر فرق ہے کہ اس تاریکی میں وقت تو ضائع ہو جاتا ہے لیکن اخلاق پر برا اثر نہیں پڑتا۔ اس لئے کہ وہ قصے مریح کذب اور عادت مستحیل ہیں مثلاً گل بکا دلی کا قصہ۔ بکا دلی کی تصویر اور جنوں کی عمل داری وغیرہ من الخرافات، ان قصوں سے کوئی ترکیب بد معاشی کی نہیں سیکھ سکتا۔ کیونکہ اس میں وصال بکا دلی کا طریقہ ایک جن کا مہربان ہو کر پیو پچا دینا ہے تو اس کو کوئی کس طرح حاصل کریگا۔ بخلاف ناولوں کے کہ اس میں لکھا ہے کہ ماما کے ہاتھ رقعہ بھیج دیا جس کو شخص کر سکتا ہے۔ ناول کا طرز جو نکم لیا دکھلایا جاتا ہے جیسے واقعات ہوتے ہیں اس لئے اس کا ایک ترغیب پڑتا ہے کہ اکثر آدمی اس کے دیکھنے سے عشق نسا دیا اطفال میں مبتلا ہوتا ہے اور قلب سوزش کی سی کیفیت ہو جاتی ہے اور یہ سخت مضر ہوتا ہے۔ (الصوم ص ۹۷)

اس شبہ کا جواب قرآن مجید میں تکرار مضامین کیوں ہے

اللہ تعالیٰ نے تمام احکام کو صاف صاف بیان فرمادیا۔ اور ایک مرتبہ نہیں بلکہ مکرر سے کر بیان فرمایا کہ کوئی اشتباہ ہی نہیں رہا، ہم نے کیا کیا کہ اس کی قدر تو کی نہیں برعکس اس میں شبہات نکالنے لگے، کہ حق تعالیٰ نے اس مضمون کو تکرار کیوں بیان فرمایا۔

اللہ تعالیٰ نے اس تکرار کی حکمت یہی ارشاد فرمائی ہے چنانچہ فرماتے ہیں وَلَقَدْ صَوَّفْنَا الْقُرْآنَ لِلنَّاسِ لِيَذُكَّرُوا یعنی ہم نے لوگوں کے لئے طرح طرح سے اس لئے بیان کیا ہے تاکہ نصیحت قبول کریں۔

اس کی قدر اس کو ہوگی جو باپ کی شفقت کو پیش نظر رکھے دیکھو باپ بیٹے کو کس طرح سے سمجھاتا ہے صرف ایک مرتبہ کہ سمجھانے پر اکتفا نہیں کرتا اور نہ ایک مرتبہ سمجھانے کے بعد مواخذہ کرتا ہے بلکہ ایک مرتبہ سمجھاتا ہے دوسری تیسری چوتھی مرتبہ بار بار سمجھاتا ہے جب تک کہ بیٹے کی اصلاح نہ ہو اسکو چہین نہیں آتا۔ جب بالکل لاچار ہو جاتا ہے مجبوری زبرد تو فین سے کام لیتا ہے پھر اس میں بھی ایلام اور ایذا مقصود نہیں ہوتا۔ بلکہ اس کی درستی اور تہذیب مد نظر ہوتی ہے حق تعالیٰ کو تو باپ سے بدرجہا زیادہ شفقت ہے اور اس کو باپ سے زیادہ اسکے مصالح کی رعایت ہے۔ اسی وجہ سے ایک ہی مضمون کو مختلف عنوانوں نوع بنوع کے طرز سے بیان فرمایا ہے۔ اور پھر باپ کے احسان اور حق تعالیٰ کے احسانات میں فرق عظیم یہ ہے کہ باپ کو بیٹے کے حال پر جو عنایت ہے اس کا منشا تو غرض ہے، کہ باپ کو یہ امید ہوتی ہے کہ بیٹا میرے کام آوے گا۔ یا یہ کہ اس سے میرا نام چلے گا۔ اور کچھ نہیں یہ ضرور ہے کہ اللہ تعالیٰ نے اولاد کے ساتھ ایسا علاقہ پیدا کر دیا ہے کہ اس سے وہ اس کی تربیت و صلاح کی طرف مضطرب ہوتا ہے اور اسی سے اس کو راحت ہوتی ہے۔

بہر حال کوئی نہ کوئی غرض ضرور ہوتی ہے اور حق تعالیٰ کو انسان کی کوئی احتیاج نہیں ہے غنی بالذات ہے اور نہ ہماری طرح کسی شئی سے وہ متاثر ہوتے ہیں، ہم تو محبت سے یا کسی دوسری عرض سے مجبور بھی ہو جاتے ہیں

اور وہاں چونکہ غنی ذاتی ہے اسلئے کسی شئی کی احتیاج نہیں اور ما سوا اس کے سب محتاج ہیں بلکہ انسان احتیاج میں تمام مخلوقات سے اول نمبر ہے۔ اسلئے کہ اگر عالم میں انسان نہ رہے تو کسی شئی میں کوئی خلل نہ آوے سب اپنے حال پر رہیں اور اگر عالم میں سے ایک شئی بھی نہ رہے تو انسان کی بقا دشواری ہو جائے۔ مثلاً پانی نہ رہے یا آگ نہ رہے تو انسان زندہ نہیں رہ سکتا اور اگر انسان ایک بھی نہ رہے تو ان چیزوں میں سے کسی کا کچھ بھی نقصان نہیں۔ اس سے صاف معلوم ہوا کہ انسان ہر شئی کا محتاج ہے۔

اور یہ بات کہ باوجود اشرف المخلوقات ہونے کے یہ اتنا محتاج کیوں ہوا۔ سو **تحتاجی کی وجہ** را از اس میں یہ ہے کہ اس کو اپنی اشرفیت پر نظر کر کے عجب ہو جائے اس لئے اتنی حاجتیں اس کے پیچھے لگا دی گئی ہیں کہ جب نازا در فر ہو تو فوراً اس طرف بھی نظر کرے کہ میں کیا نازا کر دوں میں تو ایک ایک جزو عالم کا محتاج ہوں۔ اس کے سوا اور بھی حکمتیں ہونگی۔

اللہ تعالیٰ محتاج نہیں بہر حال انسان سب چیزوں کا محتاج ہے اور کوئی شئی انسان کی محتاج نہیں ہے۔ اور اللہ تعالیٰ کو انسان کی کیا احتیاج ہوئی۔ جن چیزوں کا انسان خود محتاج ہے اللہ تعالیٰ کو ان کی بھی احتیاج نہیں بلکہ یہ امر عقلاً و نقلاً ثابت ہے کہ ہر شئی اپنے وجود اور بقا میں حق تعالیٰ کی محتاج ہے۔ پس حق تعالیٰ کے اس استغناء اور انسان کے احوج ترین مخلوقات ہونے کا افتقار تو یہ تھا کہ انسان کی بات بھی نہ پوچھتے اور احکام کا مخالف نہ بناتے لیکن اس سے یہ لازم نہ آتا کہ حقوق بھی نہ ہوتے، حقوق تو ضرور ہی ہوتے ہیں۔ پس جب حقوق ہوتے اور ان کے ادا کا طریقہ بتلایا نہ جاتا تو سخت مصیبت ہوتی جو آقا اشاروں اور رموز پر خادموں کو چلاتے ہیں خادموں کو سخت مصیبت کا سامنا ہوتا ہے اور ایک دہری کوئی ایسا نکل آتا ہے جو اتمام مزاج شناس ہو کہ اشارہ کو سمجھے۔

شاہزادہ ایران کا واقعہ علی حزیں شاہزادہ ایران کو اتفاق سے ایک خادم رمضان نام ایسا مل گیا تھا کہ اشاروں کو سمجھتا تھا۔ ایک مرتبہ علی حزیں نے شاہ دہلی سے درخواست کی کہ ہم کو ایک سلیقہ دار خادم کی ضرورت ہے بادشاہ نے ایک بڑے ہوشیار شخص کو بھیج دیا۔

علی حزیں باغ میں بیٹھے تھے اور نیاز خدمت گار باغ کے دروازے پر تھا۔ ایک شخص آیا اور اس نے ایک رقعہ دیا۔ اس خادم نے وہ رقعہ پھونچا دیا اس میں درخواست تھی کہ لیوں غائب

فرمائیے۔ علیٰ خزینے چہرہ پر بل ڈال کر وہ رقعہ واپس دیدیا۔ یہ خادم سخت پریشان ہوا کہ زبان کو توند کر لیا اور چہرہ سے ناگواری کے آثار معلوم ہوتے ہیں۔ یہ کس بات پر بگڑے ہیں۔ اتفاق سے وہاں رمضان بھی آنکلا اس سے خدمت گارنے سارا قصہ بیان کیا۔ رمضان نے کہا چہرہ پر بل ڈال کر رقعہ دیے کا مطلب یہ ہے کہ لیویدو، لیویدو ترش ہوتا ہے انھوں نے چہرہ ترش کر کے بتلادیا وہ خادم یہ سنکر بھاگا۔ اور سوچا کہ میں یہاں ہوں گا تو سخت مصیبت میں رہوں گا۔ یہ حکایت صحیح ہے یا غلط ہے بہر حال میرا مطلب یہ ہے کہ اگر اللہ تعالیٰ بھی اشاروں سے کام لیتے توحق تھا لیکن مصیبت ہوتی۔ اور ان اشاروں کو سمجھنے والا کون تھا سو ایسا نہیں کیا بلکہ ایک مضمون کو خوب کھول کر دودو مرتبہ تین تین مرتبہ بیان فرمایا اور بیان بھی اس طور سے نہیں فرمایا کہ کوئی پرچہ بھیج دے کہ اس کے پڑھنے اور سمجھنے یا عمل کرنے میں دقت ہوئی بلکہ ایک عجیب اور فطرت کے موافق طریقہ اختیار فرمایا۔ وہ یہ ہے کہ ایسی ذات مقدس کو بھیجا جن کی شان یہ ہے لقد جاءکم رسول من انفسکم یعنی تمہارے پاس ایک رسول آئے ہیں تمہاری جنس سے پس حضورؐ کا ہماری جنس سے ہونا ایک نعمت تو ہے اسلئے اگر کسی فرشتہ یا جن کو نہ بھیج دیتے تو سب ہیبت ہی کے مارے مرجاتے اور آپس میں کچھ مناسبت نہ ہوتی۔

آج کل لوگ اس فکر میں ہیں کہ پیغمبر کو عبدیت اور بشریت کے مرتبے سے گذار کر الٰہ تک پہنچادیں، گویا اس صفت کو مٹانا چاہتے ہیں کہ جو ہمارے اور ذات حق میں واسطہ اضافت ہوئی ہے حالانکہ عین رحمت الٰہی اور عین کمال نبویؐ بھی ہے کہ بشر ہو کر قرب کے ایسے درجہ پر پہنچے یہ تو کمال تھا اور رحمت اسلئے ہے کہ بشریت کی مناسبت سے بے راہوں کو راہ پر لادیں (اشکرمہ ۱۵)

۲۷) پردہ مروجہ پر اعتراض کا جواب

جواب (۱) حق تعالیٰ نے بنوں کو زینت حیوۃ الدنیا بتلایا ہے ثبات کو میان نہیں فرمایا۔ اس کی وجہ یا تو یہ ہے کہ ثبات کو خود تم نے بھی بے حقیقت سمجھ رکھا ہے کیونکہ لوگوں کو لڑکوں سے

زیادہ خوشی ہوتی ہے اور لڑکیوں کو تو عموماً وبال سمجھتے ہیں۔ تو تمہارے نزدیک وہ کیا خاک زینت دنیا ہو گئی۔ دوسرا نکتہ بیانات کے ذکر نہ کرنے میں یہ ہے کہ حق تعالیٰ نے یہ بتلادیا کہ ثبات زینت دنیا بھی نہیں ہیں بلکہ محض زینت خاندان ہیں۔ اگر وہ بھی زینت دنیا ہوتیں توحق تعالیٰ ان کو بھی یہاں ذکر فرماتے پس صرف بنوں کو زینت دنیا فرمایا اور عنایت کو ذکر نہ فرمایا اس کی دلیل یہ ہے کہ لڑکیاں دنیا کی زینت نہیں ہیں کیونکہ عرفاً زینت دنیا وہ سمجھی جاتی ہیں جو منظر عام پر زینت بخش ہو اور وہ ایسی زینت نہیں ہیں کہ تم ان کو ساتھ لئے پھر دو اور سب دیکھیں کہ انکی اتنی لڑکیاں ہیں اور ایسی آراستہ و پیراستہ ہیں بلکہ وہ محض گھر کی زینت ہیں یہاں سے پردہ کی دلیل کی طرف اشارہ نکل آیا۔

عورت کا پردہ دوسرے نکتے سے بھی اس کی تائید ہوتی ہے کہ عورتوں کا پردہ کرایا جائے کیونکہ اردو میں عورت کو عورت کہتے جس کے معنی لغت میں چھپانے کی چیز کے ہیں تو اس کے ساتھ یہ کہنا کہ عورت کو پردہ نہ کراؤ ایسا ہے جیسا یوں کہا جائے کہ کھانے کی چیز کو نہ کھاؤ پھنکے کی چیز کو نہ پیو اور اس کا لغو ہو نا ظاہر ہے کہ عورتوں کا پردہ نہ کراؤ انکو عورت کہنا خود اس کی دلیل ہے کہ وہ پردہ میں رہنے کی چیزیں ہیں۔ ایک ترقی یافتہ کہتے تھے کہ عورتیں پردہ کی وجہ سے ترقی علم سے رکی ہوئی ہیں۔ میں نے کہا جی ہاں سی واسطے تو ان چھوٹی قوموں کی عورتیں جو پردہ نہیں کرتیں بہت تعلیم یافتہ ہو گئی ہیں۔ یہ جواب سن کر وہ خاموش ہی تو رہ گئے۔

پردہ تعلیم کیلئے مضر نہیں اصل بات یہ ہے کہ تعلیم یافتہ ہونے میں پردہ یا بے پردگی کو کوئی دخل نہیں بلکہ اس میں بڑا دخل توجہ کو ہے۔ اگر کسی قوم کی عورتوں کی تعلیم پر توجہ ہو تو وہ پردہ میں بھی تعلیم دے سکتے ہیں درنہ بے پردگی میں بھی کچھ نہیں ہو سکتا، بلکہ غور کیا جائے تو پردہ میں تعلیم زیادہ ہو سکتی ہے، کیونکہ تعلیم کے لئے ایکسوئی اور اجتماع خیال کی ضرورت ہے اور وہ گوشہ تنہائی میں زیادہ حاصل ہوتی ہے۔ اس واسطے مرد بھی مطالعہ کے لئے گوشہ تنہائی تلاش کیا کرتے ہیں۔ جیسا کہ طلباء کو اسکا اچھی طرح اندازہ ہے۔

عَلَيْهِنَّ جُنَاحٌ أَنْ يَضَعْنَ ثِيَابَهُنَّ غَيْرَ مُتَبَرِّجَاتٍ بِزِينَةٍ یعنی جو عورتیں بوڑھی ہوں وہ اگر اپنے زائد کپڑے اتار کر رکھیں۔ جیسے اوپر تلے کپڑے ہوں اور اوپر کا کپڑا اتار دیں بشرطیکہ بدن ظاہر نہ ہو تو کچھ حرج نہیں، لیکن اس حالت میں بھی اپنے مواقعِ زینت کو ظاہر نہ کریں مثلاً گردن کان کران میں زیور پہنا جاتا ہے۔ اور آگے ارشاد ہے دَأْنُ يَسْتَعْفِفْنَ خِيَرَتَهُنَّ یعنی یہ زائد کپڑے اتار کر رکھنے سے بچیں تو ان کیلئے زیادہ بہتر ہے۔

پس جب بوڑھیوں تک کیلئے یہ حکم ہے تو اے لڑکیو! اور اے جوان عورتو! تم کو کہاں اجازت ہوگی کہ دور دور کے رشتہ داروں کے سامنے بے عجاآباد حضور صلی اللہ علیہ وسلم سے زیادہ تو کوئی نہ ہو نہ ہو گا خود حضور صلی اللہ علیہ وسلم اپنے سے عورتوں کو پردہ کراتے تھے۔

اور اس سے یہ بھی معلوم ہو گیا کہ آجکل جو بعضے تو تعلیم یافتہ کہتے ہیں کہ پردہ ضروری نہیں ہے اور ایسا پردہ قرآن و حدیث سے ثابت نہیں محض غلط ہے۔ بات یہ ہے کہ ان لوگوں نے قرآن و حدیث کو دیکھا ہی نہیں بس دیکھا کیا ہے کوئی اخبار دیکھ لیا کچھ عربی پڑھی ہے تو مہری اخبار دیکھ لیا سو سمجھ لو کہ یہ پردہ جو آج کل مروج ہے یہ قرآن سے بھی ثابت ہے اور حدیث سے بھی ثابت ہے چنانچہ حدیث شریف میں آیا ہے کہ ایک عورت نے حضور صلی اللہ علیہ وسلم کو پردہ کے پیچھے سے خط دیا۔

اس سے صاف معلوم ہوتا ہے کہ حضور صلی اللہ علیہ وسلم اپنے سامنے عورتوں کو نہ آنے دیتے تھے اور قرآن اور پر گزر رہے! پھر جب کہ حضور صلی اللہ علیہ وسلم خود سے پردہ کرادیں، تو کون سا پر ہے اور کون سا رشتہ دار ہے جس سے بے حجابی جائز ہوگی خواہ کوئی خالو ہو یا بھوپھا، دادا گھٹا ہو یا چچا اگر وہ محرم نہ ہو اجنبی ہے پڑا ظلم و ستم ہے کہ عورتوں کو اس کی کچھ پردہ نہیں ہے۔

ہم نے مانا کہ تمہارا دل پاک ہے لیکن تم کو دوسرے کی کیا خبر، اگر کہو کہ دوسرا بھی پاک ہے تو توبہ تو بہ خدا اور رسول کو تم نے ظالم قرار دیا کہ باوجودیکہ یہ پاک تھا پھر بھی اس سے پردہ کا حکم دیا۔ اگر یہ پاک صاف ہوتے تو حق تعالیٰ ضرور ان کا نام لکھ دیتے کہ فلاں شخص پاک ہے۔

حضرت یوسف علیہ السلام کا قول یاد رکھو اللہ تعالیٰ کو سب خبر ہے کہ کون پاک ہے اور کون نہیں ہے انبیاء سے زیادہ تو کوئی نہیں ہو سکتا۔ یوسف علیہ السلام باوجود نبی ہونے کے فرماتے ہیں وَمَا أُبْرِيءُ نَفْسِي إِنَّ النَّفْسَ

پس عورتوں کا پردہ میں رہنا تو علوم کے لئے معین ہے نہ کہ مانع نہ معلوم لوگوں کی عقلیں کیا ہوئیں جو پردہ کو تسلیم کا منافی سمجھتے ہیں ہاں علوم تجارت کے لئے سیر و سیاحت کی البدھ ضرورت ہے مگر عورتیں ناقص العقل اور کم حوصلہ ہیں ان کے لئے سیر و سیاحت سے تجربے میں حقیقی یعنی اخلاقی ترقی نہ ہوگی۔ بلکہ آزادی اور شرارت بڑھے گی اس لئے شریعت نے عورتوں کے ہاتھ میں طلاق نہیں دی۔ کیونکہ یہ ایسی کم حوصلہ ہیں کہ ذرا سی بات پر آپے سے باہر ہو جاتی ہیں۔ مرد تو برسوں میں کسی بہت بڑی بات پر طلاق کا قصد کرتا ہے۔ وہ بھی ہزار بار میں سے ایک درز زیادہ تو ایسے ہی مرد ہیں جو عورت کی بدتمیزیوں پر صبر کرتے ہیں۔ اور اگر عورتوں کے ہاتھ میں طلاق ہوتی تو ہر ہمینہ شوہر کو طلاق دے کر نئی شادیاں کیا کرتیں۔

پس عورتوں کے لئے مہی سیر و سیاحت کا کافی ہے کہ اپنے گھر میں جل پھر لیا کریں۔ جن تجربوں کی انکو ضرورت ہے وہ گھر میں رہ کر ہی انکو حاصل ہو سکتے ہیں بلکہ میں تو کہتا ہوں کہ نظر حقیقت میں سے دیکھئے تو مردوں کو بھی اس کی ضرورت نہیں۔ اگر سیر و تماشا چاہتے ہو تو وہ بھی آپ کے اندر موجود ہے دل کی آنکھوں سے دیکھ لو۔ تم کو اپنے ہی اندر ایسا تماشا نظر آئے گا کہ دنیا کے پھول پھلواڑیوں سے استغناء ہو جائے گا۔

ستم است گر پے کشد کہ میر سرو من درآ
توز غنچم کند میدہ در دل کشا پنجم درآ
چوں کوئے دوست ہست بھرا چہ حاجت ست
خلوت گزیدہ را بمتا شا چہ حاجت ست

(مظاہر الآمال ص ۱۳)

پردہ کی اہمیت جو اہل مردوں کو تو یہ حکم فرمایا قُلْ لِلْمُؤْمِنِينَ يَعْصُوا مِنْ أَبْصَارِهِمْ وَيَحْفَظُوا أَرْوَاحَهُمْ یعنی آپ مومنین سے کہدیتے کہ اپنی نگاہوں کو نجی رکھیں اور اپنی شرمگاہوں کی حفاظت کریں، اور عورتوں کے لئے یہ بھی حکم فرمایا اور اس پر اضا فرمایا وَلَا يُبْدِينَ زِينَتَهُنَّ یعنی بناؤ سنگار کا موقع ظاہر نہ کریں۔ اور ظاہر ہے کہ بناؤ سنگار کا موقع وہ ہے کہ اکثر کھلا رہتا ہے جب اس کا اظہار بھی اجانب کے سامنے جائز نہیں تو باقی تمام بدن کا تو کیسے جائز ہو گا۔

اور دوسرے مقام پر ارشاد ہے وَالْقَوَاعِدُ مِنَ النِّسَاءِ الَّتِي لَا يَرْجُونَ نِكَاحًا فَلَيْسَ

لَا مَارَکَ بِالسُّوءِ إِلَّا مَنْ رَحِمَ رَبِّی یعنی میں اپنے نفس کو بری نہیں کرتا ہوں، نفس تو بری بات کا حکم کرنے والا ہی ہے، مگر جس پر میرا رب رحمت فرمائے کہ وہ مستثنیٰ ہے۔

نفس کی پاکی کا دعویٰ

اب بتلانے کے کس کام نہ ہے جو کہے کہ میرا نفس پاک ہے۔ مجھ کو برا دوسرے نہیں آتا اور اگر ایسا اتفاق ہوتا ہے تو وہ عارضی حالت ہے چنانچہ بعض بزرگوں کو اس میں دھوکا بھی ہوا ہے کہ انھوں نے جب دیکھا کہ انکو دوسرے نہیں آتا تو یوں سمجھے کہ ہمارا نفس مزکی ہو گیا ہے اسلئے انھوں نے غیر محرم کے اختلاط میں کوئی باک نہیں کیا اور پھر کسی فتنہ میں مبتلا ہو گئے خواہ وہ فتنہ قلبی کا ہو۔ اور یہ کارگذاری شیطان کی ہے کہ اس ترکیب سے کہاں سے کہاں تک لایا۔ اسی واسطے حق تعالیٰ نے اول یہ تدبیر بتلائی کہ نگاہ بچی رکھو۔ اگر بھڑکتی تم کو کسی غیر کے سامنے آتا پڑے تو نگاہ بچی اور کپڑوں میں لپیٹ کر آؤ۔ یہ نگاہ بظاہر ہے بہت خفیف لیکن اصل تمام پھول پھیل کی یہی ہے جیسے زکام ہے کہ بظاہر بہت ہلکی بیماری ہے لیکن سیکڑوں بیماریوں کا منشأ ہو جاتا ہے اسی طرح نظر بھی ہے کہ اگر یہ بگڑ گئی تو پھر آئندہ امن اٹھ گیا اسی واسطے دل اسی کو روکا ہے۔

ازواج مطہرات کا پردہ

دیکھو نبی صلی اللہ علیہ وسلم کی بیبیوں سے تو زیادہ کوئی عورت نہیں ہو سکتی ہیں تم کو قصہ سناتا ہوں جس سے تم کو اندازہ ہو گا کہ پردہ کس درجہ ضروری ہے۔

حضرت عبداللہ بن ام مکتوم رضی اللہ عنہ ایک نابینا صحابی ہیں اور ایک مرتبہ حضور صلی اللہ علیہ وسلم کی خدمت میں آئے ازواج مطہرات میں سے غالباً حضرت عائشہ رضی اللہ عنہا اور حضرت ام سلمہ رضی اللہ عنہا بیٹھی تھیں حضور صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا کہ تم پردہ میں ہو جاؤ۔ انھوں نے عرض کیا کہ یا رسول اللہ تو نابینا ہیں۔ حضور صلی اللہ علیہ وسلم فرماتے ہیں افعیبتما دان انتما لستم تبصرون، یعنی کیا تم بھی اندھی ہو اسکو دیکھتی نہیں ہو۔

دیکھو حضور صلی اللہ علیہ وسلم کی بیبیاں امہات المؤمنین دوسری طرف نابینا صحابی، بھلا یہاں کون سے دوسرے کا احتمال ہو سکتا ہے، مگر پھر بھی کس درجہ اہتمام کرایا۔ (العصۃ ص ۷)

علماء ترقی سے مانع نہیں ہیں

(۲۸)

جواب (۱)۔ لوگ علماء کو ترقی سے مانع کہتے ہیں۔ آج میں اس الزام کو دفع کرنا

چاہتا ہوں اور اس وقت میں ترقی کی ضرورت ہی پر بیان کروں گا اس پر جنٹلمین چونکے کہ یہ ملا آدمی اور ترقی کا بیان۔ میں نے کہا کہ آپ تو ترقی کو صرف عقلی ضروری ہی کہتے اور میں اسے شرعی فرض کہتا ہوں۔ اس پر ادر بھی حیرت ہوئی۔ میں نے کہا حق تعالیٰ فرماتے ہیں وَکَلَّ وَجْهَهُ اَهُمَّوْ لَیْهَا فَاسْتَبَقُوا الْخَیْرَاتِ یعنی ہر قوم کے لئے ایک جہت قبلہ مقرر ہے جس کی طرف وہ منہ کرتی ہے۔ پس ایک دوسرے پر سبقت کرو۔

اس آیت میں حق تعالیٰ نے ہم کو استباق کا حکم دیا جس کے معنی ایک دوسرے پر سبقت کرنے کے ہیں۔

تو اب جو لوگ علماء کو ترقی سے مانع کہتے ہیں وہ ان پر کتنا بڑا افتراء کرتے ہیں۔ بھلا جس چیز کا قرآن میں امر ہے علماء کی مجال ہے کہ اس سے منع کر سکیں۔ پس ترقی کا ضروری ہونا تو متفق علیہ ہے البتہ اس کے طریقہ میں اختلاف ہے۔ جنٹلمین کہتے ہیں کہ جس طرح ہم کہیں اسی طرح ترقی کرو اور علماء کہتے ہیں کہ جس طرح قرآن کہے۔ اسی طرح ترقی کرو۔ سو قرآن میں فاستبقوا کے ساتھ الخیرات کی بھی قید ہے جس کا حاصل یہ ہوا کہ نیک کاموں میں ترقی کرو۔

اب اس اختلاف کا فیصلہ بہت جلد ہو سکتا ہے۔ آپ یہ ثابت کر دیں کہ جس ترقی کے آپ خواہاں ہیں وہ ترقی فی الخیر ہے تو میں اس کا ذمہ لیتا ہوں کہ علماء آپ کو اس ترقی سے منع نہ کریں گے اور اگر ترقی فی الشرع ہے تو اس کا مطلوب نہ ہونا بلکہ مذموم ہونا تمام عقلاء کے نزدیک مسلم ہے ورنہ پھر ایک ڈاکو کو بھی یہ کہنے کا حق ہے کہ مجھے ڈاکہ سے کیوں منع کیا جاتا ہے۔ میں تو ترقی کا طالب ہوں، بتلائیے اسے کیا جواب دیں گے؟

ترقی محمود مطلوب ہے

ظاہر ہے کہ اس سے یہی کہا جائے گا کہ تیری یہ ترقی محمود نہیں بلکہ ترقی مذموم ہے جو کہ برے طریقے سے حاصل کی جاتی ہے معلوم ہوا کہ ترقی مطلقاً مطلوب نہیں بلکہ وہی مطلوب ہے جو محمود ہو مذموم نہ ہو۔ بس اب یا تو آپ ثابت کر دیں کہ جس ترقی کے آپ طالب ہیں وہ محمود ہے، مذموم نہیں، یا ہم ثابت کر دیں کہ ترقی محمود وہی ہے جس کی ہم تعلیم دے رہے ہیں۔ اور یہ ترقی مذموم ہے جس کی تعلیم آپ دے رہے ہیں۔

اس تقریر سے بہت جلد سمجھ گئے اور اقرار کر لیا کہ واقعی علماء کو ترقی سے اختلاف نہیں بلکہ اس کے طریقہ میں تفصیل سے اختلاف ہے، کیونکہ ان طریقہ نے خلاف شرع ہونے کی

وجہ سے اس ترقی کو ترقی فی الشرکامصدق بنادیا ہے۔

غرض دوسری قوموں کی ترقی دیکھ کر مسلمانوں کے منہ میں پانی بھر آتا ہے اور وہ انکی ہر حالت کو ترقی میں دخیل سمجھ کر اختیار کرتے جاتے ہیں۔ کبھی ان کی صورت و وضع کو اختیار کرتے ہیں کہ شاید اس کو ترقی میں دخل ہو، کبھی عورتوں کے پردہ کو اٹھانا چاہتے ہیں کہ یہی ترقی سے مانع ہے۔ اگر عورتیں آزاد ہوں گی تو علوم صنعت و حرفت سیکھ کر خود بھی ترقی کریں گی اور اولاد کو بھی ترقی یافتہ بنائیں گی۔

ایک صاحب نے میرے سامنے یہی دلیل بیان کی تھی۔ میں نے کہا کہ مسلمانوں میں صرف شرفار کی عورتیں پردہ نشین ہیں جن کی تعداد ہندوستان میں بہت کم ہے زیادہ تعداد تو چھوٹی قوموں کی ہے اور ان میں پردہ کا ہمیشہ سے رواج نہیں ہے۔ اگر بے پردگی کو ترقی میں کچھ دخل ہے تو ان قوموں نے کیوں نہ کر لی۔ پس اس کا جواب کچھ نہ تھا، وہ میرے منہ کو تکنے لگے۔ (العبرة بذبح البقرة ص ۴۵)

جواب (۲)۔ یہ سب کہتے ہیں کہ عزت و ترقی حاصل کرنا چاہئے اور اس کے ساتھ ہی علماء پر یہ الزام لگاتے ہیں کہ علماء ترقی کے مانع ہیں، میں کہتا ہوں کہ اس میں کچھ شک نہیں کہ عزت حاصل کرنا چاہئے اور علماء اس کے مانع نہیں ہیں۔ اور علماء کیسے مانع ہوتے جس شئی کو قرآن و حدیث ثابت کرتے ہیں اس کو کون سا مولوی مٹانے والا ہے حق تعالیٰ فرماتے ہیں۔ **وَاللّٰهُ اَعْلَمُ بِمَا لِرُسُوْلٍہٗا وَّلِیْمُوْمِنِیْنَ** یعنی اللہ ہی کے لئے عزت اور اس کے رسول کے لئے اور مومنین کے لئے، بھلا جس شخص کا اس آیت پر ایمان ہو گا وہ کیسے اس کی نفی کرے گا۔ پھر علماء پر الزام کیسا؟ بات یہ ہے کہ ان کی بات پوری طرح سستے تو ہیں نہیں بے سوچے سمجھے ہانک دیا کہ علماء ترقی سے روکتے ہیں۔

صباحو! علماء ترقی سے مانع نہیں ہیں علماء جو طالبان ترقی پر اعتراض کرتے ہیں۔ وہ نفس ترقی کی طلب پر نہیں بلکہ اس کا حاصل یہ ہے کہ آپ لوگ اس کو غیر طریق سے حاصل کر رہے ہیں طریق یہ نہیں ہے اگر کوئی پشاور جانا چاہے اور ٹکٹ لے لے کلکتہ کا اور اس کو کوئی اسکی غلطی پر آگاہ کرے تو وہ پشاور جانے کا اور ریل میں سوار ہونے کا مخالفت نہیں بلکہ طریق کے اندر مخالفت کرتا ہے اور یہ کہتا ہے کہ رستہ یہ نہیں ہے۔ پشاور کو دوسری گاڑی جاوے گی۔ اس کا

ٹکٹ لے لو وہ تم کو پشاور پہنچا دے گی۔

ریل کا ایک واقعہ میرے ایک ہموطن اسٹیشن سہارنپور سے میرٹھ جانے والے کھنؤ جانے والی گاڑی میں غلطی سے سوار ہو گئے۔ اتفاق سے میں بھی کھنؤ جا رہا تھا۔ عین روانگی کے وقت تو ان سے کوئی بات ہوئی نہیں اس لئے کہ خیال ہوا کہ یہ تو گاڑی میں موجود ہیں ہی۔ ان سے باطلیمان بات کر دیں گا۔ جو لوگ مجھ کو پہنچانے کے لئے آئے تھے ان سے باتیں کرتا رہا۔ جب ریل چھوٹ گئی تو انکی طرف متوجہ ہوا۔ میں نے پوچھا کہ آپ کہاں جاتیں گے۔ کہنے لگے کہ میرٹھ، میں نے کہا کہ ممکن ہے کہ آپ میرٹھ جائیں مگر یہ گاڑی میرٹھ نہ جائے گی یہ تو روڑ کی ہوتی ہوئی سیدھی کھنؤ پہنچے گی۔ یہ سن کر تو بہت چکر لائے اور سردی کا موسم تھا۔ ان جنٹلمینوں کو یہ بھی مرض ہے کہ کپڑا ساتھ نہیں لیتے اور رضائی اور ردی دارانگہ کھانپنے کو خلاف تہذیب سمجھتے ہیں۔ بیک بینی و دد گوش ہی سہ کر تے ہیں ایسے ہی وہ بھی تھے، خیر وہ روڑ کی اترے پھر دہلی سے اخیر شب میں میرٹھ پہنچے۔ پس دیکھے میں ان کے ریل میں سوار ہونے کا اور میرٹھ جانے کا مخالفت نہیں تھا بلکہ گفتگو یہ بھی کہ آپ نے طریق میں غلطی کی۔

پس علماء کو اگر کہیں طالبان ترقی پر اعتراض کرتے ہوئے سنا ہے تو اس کا مطلب یہ نہیں کہ وہ ترقی کے مخالفت ہیں، ان کا مطلب یہ ہے کہ جس طریق سے آپ ترقی کو حاصل کرنا چاہتے ہیں یہ طریق اس کا نہیں ہے۔

ترسم نہ رسی بہ کعبہ اے اعزابی :۔ کیس راہ کہ تو میر دی بہترستان ست طریق اس کا وہ ہے جو مولوی بتاتے ہیں، خدا اور رسول نے جو بتایا ہے وہ طریقہ ہے۔ مولوی بیچارے تو سرکاری حکم کے منادی کرنے والے ہیں۔ منادی کرنے والے سے اگر کوئی معارضہ اور مناظرہ کرے تو وہ یہی کہے گا کہ میں تو منادی کرنے والا ہوں مجھ سے گنجب نہ کر۔ اس کی ایسی مثال ہے جیسے چیرا سی سمن لایا اور اس سے مباحثہ کرنے لگے تو ایسے شخص پر دد جرم قائم ہوں گے ایک تو تفصیل نہ کرنے کا، دوسرے سرکاری آدمی سے مقابلہ کرنے کا۔ پس یا د رکھو کہ یہ علماء سرکاری آدمی ہیں ان سے منازعت کرنا جرم ہے۔

غرض طریق ترقی کا وہ نہیں جو آپ لوگوں نے اختیار کیا ہے ترقی اور عزت حاصل

کرنے کی ضرورت تو مسلم ہے لیکن طریق یہ نہیں ہے۔

اب میں اس کو بیان کرتا ہوں مگر اس کی تحقیق کے لئے اول یہ سمجھنے کی عزت حاصل کرنے کی غرض کیا ہے اور وہ کیوں ضروری ہے۔ سو لوگ تو ترقی اور عزت کے طالب ہیں کہ اس کی غرض محض بڑا بننا ہے۔ مگر میں اس کی اصل وجہ بیان کرتا ہوں کہ اس کی کس لئے ضرورت ہے۔

انسان کا مقصد

اصل یہ ہے کہ عقلی طور پر انسان کو دو چیزوں کی ضرورت ہے منافع کو حاصل کرنا اور مضمرات سے بچنا۔ آدمی جو کچھ کرتا ہے اس کی غایت صرف یہی ہوتی ہے کہ یا تو نفع کی تحصیل ہو یا مضمرات کا دفع۔ مثلاً کھانا کھانا ہے تاکہ بھوک کے ضرر سے بچے اور قوت کی منفعت حاصل ہو۔ دوا کرتا ہے تاکہ مرض دور ہو اور صحت حاصل ہو۔ غرض جو کچھ کرتا ہے یا تو جلب منفعت کیلئے یا دفع مضرت کیلئے، اور دوسرا قاعدہ عقلی یہ سمجھو کہ ضروری چیزوں کے طریقے بھی ضروری ہوتے ہیں۔ پس جلب منفعت اور دفع مضرت جس طریقے سے حاصل ہو وہ بھی ضروری ٹھہرا۔ سو طریقہ اس کا یہ ہے مال و جاہ کا حاصل ہونا۔ مال تو اصل میں منافع کی تحصیل کے واسطے ہے اور جاہ اصل میں دفع مضرت کے واسطے ہے، گو کبھی کبھی جاہ سے خطرہ میں بھی پڑنے کا احتمال ہے، لیکن وہ بحیثیت جاہ ہونے کے خطرہ کا سبب نہیں ہوتی اس لئے کہ جاہ فی حد ذاتہ خطرات سے بچانے والی ہے بلکہ سبب وقوع فی الخطرہ کا قلت جاہ ہوتی ہے۔ مثلاً بھینٹے بھینٹے لوگوں کے کچھ دشمن ہو گئے اور آزار پہنچایا تو یہ ایذا جاہ کے سبب سے نہیں ہوتی جاہ کے محدود ہونے کی وجہ سے ہے اگر غلبہ پورا ہوتا تو اس کا کوئی کچھ نہ بگاڑ سکتا اسی واسطے حق تعالیٰ کا کوئی کچھ نہیں کر سکتا۔ اس لئے کہ غلبہ اور عزت غیر محدود اور کامل درجہ میں ہے۔ لیکن تاہم جاہ ہی ایسی شئی ہے جو بہت سے مصائب اور خطرات سے آدمی کو بچاتی ہے۔ مثلاً اب ہم اطمینان سے بیٹھے ہیں، کوئی ہم کو ذلیل نہیں کر سکتا۔ بیگار میں نہیں پکڑ سکتا۔ تو اس کا سبب کیا ہے۔ یہی ہے کہ اللہ تعالیٰ نے عزت عطا فرمائی ہے۔ بخلاف ان لوگوں کے جن کو عزت حاصل نہیں ہے۔ پولیس نے حکم دیدیا کہ دس چاروں کو بیگار میں پکڑ لاؤ، بیچارے چاروں جا چار آتے ہیں۔ پس جاہ اور عزت کی غرض محض ہوتی ہے۔

اس تقریر سے معلوم ہو گیا کہ عزت اور مال دونوں مطلوب

عزت و مال مطلوب ہیں

اور محدود ہیں ہر وہ عہہ اور مذموم نہیں ہیں اور جو مال و جاہ کی مذمت کرتے ہیں ان کا عنوان تعمیری مختصر ہوتا ہے۔ مقصود و مذمت کرتا جب

مال اور حب جاہ کا ہے اور حب بھی وہ جو حق تعالیٰ کی محبت سے بڑھی ہوئی ہو کہ ان کی ہوس میں اللہ تعالیٰ کے حکم بھی پس پشت ڈال دے چنانچہ ارشاد ہے قُلْ اِنَّ كَاتِبَاتِكُمْ ذُنُوبَكُمْ وَاَحوَالِكُمْ وَانَّمَا دَاخِلُكُمْ وَعَشِيرَتُكُمْ وَاَمْوَالٌ اقْتَرَفْتُمُوهَا وَتِجَارَةٌ تَخْشَوْنَ كَسَادَهَا وَمَسَاكِنُ تَرْضَوْنَهَا احَبَّ اِلَيْكُمْ مِنَ اللَّهِ وَرَسُولِهِ وَجِهَالٍ فِي سَبِيلِهِ فَتَرْتَفَعُوا حَتَّى يَأْتِيَ اللَّهُ بِأَمْرٍ اَحَبَّ اِلَيْكُمْ مِنَ اللَّهِ سے صاف سمجھا جاتا ہے کہ مذموم اور مذمبی عنہ نہ مال ہے نہ جاہ اور نہ حب مال اور حب جاہ، بلکہ مال اور جاہ کی حب مضرت ہے۔ جو اللہ کی یاد سے غافل کر دے اور اس کے مقابلہ میں دین کی بھی پروا نہ رہے عزت اور آبرو کی ایسی حفاظت کرے کہ دین رہے یا جائے۔ مگر بات نہ جائے۔

جیسے ایک شخص ریل میں سوار تھے انھوں نے نماز پڑھی اور کہتے تھے کہ میں نے نماز اس لئے نہ پڑھی کہ ہندوؤں کا مجمع تھا اگر ان کے سامنے نماز پڑھتا تو وہ یوں کہتے کہ کیا اٹھک بیٹھک کرتا ہے اور اس سے اسلام کی اہانت ہوتی۔ استغفر اللہ یہ اس شخص کا گمان فاسد تھا اگر وہ نماز پڑھتا تو زیادہ عزت ہوتی

حکایت وزیر بھوپال ایک وزیر عظم ریاست بھوپال کی حکایت ہے کہ کسی بڑے حاکم کا لکچر ہو رہا تھا نماز کا وقت آ گیا۔ بڑے بڑے امراء و وزراء شریک تھے ان میں نمازی بے نمازی سب قسم کے تھے سب یہ سمجھ کر یہاں سے اٹھنا بڑی سبکی کی بات ہے اس لئے سب ساکت بیٹھے رہے۔ وزیر صاحب کھڑے ہو کر کہا کہ حضور نماز کا وقت آ گیا ہے ہم نماز پڑھیں گے۔ حاکم نے بہت خوشی سے کہا کہ ضرور پڑھ لیجئے وزیر صاحب کھڑے ہوئے اور لوگ بھی نماز کیلئے کھڑے ہو گئے و بارہی میں بڑی شان و شوکت سے نماز باجماعت ہوئی۔

دیکھئے عزت یہ ہے، آج کل یہ حالت ہے کہ گودین جاتا رہے مگر ہماری آبرو و عزت مزموں میں فرق نہ آنے پائے۔ ہماری آمدنی

دین سے بے رغبتی

میں فرق نہ آنے پاوے، چنانچہ مختلف تدبیروں سے خواہ وہ جائز ہوں یا ناجائز۔ کوئی مال بڑھا رہا ہے، کوئی جائیداد کی فکر میں ہے، عورتیں زیور کے بڑھانے کی فکر میں، اسی طرح جاہ کو مختلف تدبیروں سے حاصل کرتے ہیں۔ اور اس کو ریاست سمجھتے ہیں۔ آج کل ریاست کا حاصل کیا ہے کہ اپنے دباؤ اور زور سے غریبوں پر ظلم کرنا کسی کی گھاس چھین لی کسی کی زمین دبا لی وغیرہ غرض

عزت کے مقابلہ میں جب دین کی پروا نہ کی تو کیا عزت ہے۔ ہاں یہ بھیڑیے کی عزت ہے، اگر بھی بھیڑیا آجاوے تو سب کھڑے ہو جاویں خواہ وہ یہ سمجھے کہ میری تعظیم کو کھڑے ہوئے حالانکہ لوگ اپنی حفاظت کے لئے کھڑے ہوں (علی محمد) واللہ ان امارادار ظالموں کو ایسی ہی عزت ہے کہ لوگ اپنے بچاؤ کی وجہ سے ان سے ڈرتے ہیں۔ ورنہ ویسے تو کوستے اور گالیاں ہی دیتے ہیں کہ خدا تعالیٰ اسکو غارت کرے۔

عزت ہے اللہ والوں کی کہ ان کے لئے جان تک فدا کرنے کے واسطے لوگ حاضر ہیں پس حقیقی عزت یہ ہے کہ دلوں پر قبضہ کرے اور دلوں پر سکھ جائے۔ سو ایسی عزت اللہ والوں کی ہے۔ (العزۃ ص ۱۲)

(۲۸) اس تکیہ کلام اور مشہور اعتراض کا جواب کہ فلاں بات خلاف عقل ہے اسلئے قابل قبول نہیں

ہمارے بھائیوں نے ایک سبق پڑھ لیا ہے کہ جو بات ان کی سمجھ میں نہ آئے کہہ دیا کہ یہ خلاف عقل ہے اس لئے قابل قبول نہیں اور لگے نصوص میں تحریف و تاویل کرنے۔ چنانچہ ان کے نزدیک صراط پر چلنا بھی خلاف عقل ہے۔ اور ساری معادیات اور معجزات خلاف عقل ہیں، تو اس طرح انھوں نے عقائد میں بھی اختصار و انتخاب کرنا شروع کیا اب ایمان کے معنی وہ نہ رہے جو پہلے تھے یعنی تصدیق بما جاء به النبی صلی اللہ علیہ وسلم بلکہ معنی یہ ہو گئے کہ تصدیق بما اذفق عقل مما جاء به النبی صلی اللہ علیہ وسلم، یعنی ان کے نزدیک ایمان کہتے ہیں اس چیز کے ماننے کو جو حضور صلی اللہ علیہ وسلم کی بیان کردہ باتوں میں سے ان کی عقل کے مطابق ہو۔

میں کہتا ہوں کہ یہاں دو مقدمہ ہیں ایک تو یہ کہ جو بات شریعت میں عقل کے خلاف ہے تمہاری عقل کے یا سب عقلاء کی عقل کے۔ دوسری شق تو مسلم نہیں کیونکہ علماء راہین جن کی عقل کے سامنے اہل دنیا کی عقل کچھ حقیقت نہیں رکھتی وہ انکو خلاف عقل نہیں کہتے اور ہر زمانہ میں ان مسائل کو ایسی صورت پر تسلیم کرتے آئے ہیں جس صورت سے شریعت میں تعلیم دی گئی ہے۔

چنانچہ حضرات صحابہ و تابعین و علماء و صلحا ارامت سب ان کا اعتقاد ظاہر کے مطابق رکھتے آئے ہیں۔ اگر یہ کہو کہ تمہاری عقل کے خلاف ہے تو اس صورت میں صغریٰ تو مسلم مگر کبریٰ مسلم نہیں کہ جو تمہاری عقل کے خلاف ہو وہ غلط اور ناقابل قبول ہے کیونکہ قوانین سلطنت میں بہت سی باتیں تمہاری عقل میں نہیں آتی مگر تم قانون دانوں کی عقل پر اعتماد کر کے ان کو تسلیم کرتے ہو۔ اس کو بھی جانے دو۔ میں تمہیں سے پوچھتا ہوں کہ ماں کے پیٹ سے تم جس طرح پیدا ہوئے ہو کیا تمہاری عقل میں آتا ہے۔ واللہ ہم کو اس پر حیرت راسخ نہیں ہوتی کہ رات دن اس کا مشاہدہ ہو رہا ہے اگر اس کا مشاہدہ نہ ہوتا، اور صرف بیان سے یہ طریقہ معلوم ہوتا تو ہرگز عقل میں نہ آتا۔

انسان کی پیدائش اس کا امتحان اس طرح ہو سکتا ہے کہ تم ایک نوزائیدہ بچے کی اس طرح نگہ رانی کرو کہ وہ یہ بات سننے یا دیکھنے نہ پائے کہ بچہ ماں کے پیٹ سے پیدا ہوا کرتا ہے۔ اس کے بعد آپ اس کو فلسفہ اور سائنس اور طب سب کچھ پڑھائیں مگر یہ نہ پڑھائیں جس میں طرز تولد کا ذکر ہو پھر جب وہ بی، اے، اور ایم، اے اور ایل، ایل، بی ہو جائے اس وقت اس سے کہو کہ خبر بھی ہے تو کیونکر پیدا ہوا تھا اور اس سے بیان کرو کہ اول تیرا باپ تیری ماں کے پاس گیا تھا جس سے منی کے کچھ قطرے تیری ماں کے پیٹ کے اندر جو رحم ہے اس میں گرے تھے پھر رحم کے اندر اس کی پرورش ہوئی کہ خون بنا اور خون سے علقہ پھر مضغہ پھر گوشت میں ہڈیاں بنیں پھر جسم کامل تیار ہو گیا تو اس میں روح پڑی جس کی پرورش عرصہ تک خون رحم سے ہوتی رہی پھر نوزاد کے بعد تو شرمگاہ مادر سے نکلا اور اب وہی خون رحم دودھ کی شکل میں ماں کے پستان میں آ گیا جس سے دوسرے تک پرورش پاتا رہا۔ (دلی آخرہ) تو میں سچ کہتا ہوں کہ واللہ العظیم وہ نہایت سختی سے آپ کی مخالفت کرے گا اور کہیگا ایک قطرہ سے ایسے حسین جسم کا بننا پھر اس کا شرمگاہ سے جو نہایت تنگ راستہ ہے نکل آنا عقل کے بالکل خلاف ہے۔

اب بتلائیے کہ اگر یہ قاعدہ مان لیا جائے کہ جو بات جس کی عقل میں نہ آئے وہ غلط ہو اگرے تو پھر آپکا ماں کے پیٹ سے پیدا ہونا بھی غلط ہے بات یہ ہے کہ آپ خلاف عادت کو خلاف عقل کہتے ہیں جیسے نوزائیدہ بچہ جس کی ایسی نگہ رانی کی گئی ہو جس کا اد پر ذکر ہوا ماں کے پیٹ سے پیدا ہونے کو خلاف عقل کہے گا۔ کیونکہ اس نے یہ بات کبھی دیکھی یا سنی نہ تھی اور آپ اس کو خلاف عقل اس لئے نہیں کہتے کہ آپ کو اس کی عادت ہو گئی، ورنہ آپ بھی کہتے ہو وہ کہتا ہے اور ظاہر ہے کہ

خلاف عقل کا وقوع نہیں ہو سکتا۔

تو معلوم ہوا کہ آپ خلاف عقل ایسی باتوں کو بھی کہتے ہیں جن کا وقوع مشاہدہ ہوگا

خلاف عادت اور خلاف عقل میں فرق

تو وہ خلاف عقل نہ رہیں معلوم ہوا کہ آپ دراصل خلاف عادت کو خلاف عقل کہہ رہے ہیں اور کسی بات کے صحیح ہونے کے لئے خلاف عادت ہونا مضر نہیں اور نہ یہ غلط ہونے کی دلیل ہے۔ ورنہ پھر اس کے رٹکے کے قول کو بھی مان لینا چاہئے جو ماں کے پیٹ سے انسان کے پیدا ہونے کو غلط کہتا تھا۔

اور نیز بہت سی باتوں کو جنہیں آپ چار دن پہلے مستبعد اور محال سمجھتے تھے اور آج ان کا مشاہدہ ہو رہا ہے غلط کہنا چاہئے جیسے ریل کا ایک ٹکڑہ ۶۰ میل طے کر لینا اور ۵ منٹ میں لندن سے تار کے ذریعے خبر آ جانا وغیرہ وغیرہ۔

اس کے علاوہ دنیا میں بہت سے امور عادت کے خلاف ہوتے رہتے ہیں۔ میں نے مرغی کا ایک بچہ دیکھا ہے جس کے چار پیر تھے۔ اور آجکل دہلی میں دلوگیاں جڑی ہوئی نائش میں آئی تھیں جن کے تمام اعضاء جدا جدا تھے مگر کمر جڑی ہوئی تھی اور پیشاب گاہ الگ الگ تھی مگر پیشاب نکلنا ایک کے رستے سے تھا۔

تو بتلائیے کیا خلاف عادت کیلئے بھی کوئی ضابطہ ہو سکتا ہے جس کے اوپر بنا کر کے بعض امور کو مانا جائے اور کسی کے متعلق یہ کہا جا دے جو تکہ یہ خلاف عادت ہے اسلئے ہم نہیں مانتے۔ صابو! آپ کا عدم سے وجود میں آنا ہی خلاف عادت ہے۔ کیونکہ عادت کا مقصدی تو یہ ہے کہ ہر شئی اپنی حالت پر رہے جو معدوم ہے معدوم رہے اور جو موجود ہے وہ بھی فنا نہ ہو۔ مگر رات دن اس کے خلاف مشاہدہ ہو رہا ہے، ہزار ہا معدوم وجود میں آتے اور لاکھوں موجود معدوم ہو جاتے ہیں۔ معلوم ہوا کہ کسی بات کا خلاف عادت ہونا اس کے غلط ہونے کو مستلزم نہیں۔

اب دوسرا مقدمہ یہ سمجھ لیجئے کہ آپ خلاف عادت کو خلاف عقل کہتے ہیں اور ان دونوں

میں فرق نہیں کرتے حالانکہ یہ بڑی سخت غلطی ہے۔ سنے میں اس کا فرق بتلاتا ہوں۔ خلاف عادت تو وہ ہے جو عقلاً ممکن ہو مگر مشاہدہ نہ ہونے کی وجہ سے دشوار و مستبعد معلوم ہوتا ہے اور خلاف عقل وہ ہے جو عقلاً ناممکن ہے یعنی عقل کے استحصال پر دلیل قائم کر سکے اور استحصال کہتے ہیں

اجتماع نقیضین کو، تو خلاف عقل وہ ہے جس کے ماننے نقیضین کا ایک محل میں ایک آن میں ایک جہت سے مجتمع ہونا لازم آجائے۔ اب جو لوگ معادیات کو اور صراط کو ورن اعمال وغیرہ کو خلاف عقل سمجھتے ہیں وہ مہربانی کر کے ان کے استحصال پر دلیل قائم کریں اور بتلائیں کہ ان کے ماننے سے اجتماع نقیضین کیونکر لازم آتا ہے۔ یقیناً وہ ہرگز کوئی دلیل عقلی ان کے استحصال پر قائم نہیں کر سکے۔ لیکن ہمت سے بہت سی کہیں گے کہ ہماری سمجھ میں نہیں آتا کہ یہ کیونکر ہو جائے گا۔ اس کی نظیر دکھلاؤ۔ بس آج کل تمام شبہات کا حاصل یہ ہے کہ اس کی کوئی نظیر نہیں ملتی اسلئے یہ محال ہے اور جو دعویٰ امکان کا کرتا ہے وہ اس کی نظیر دکھلائے۔ عجب اندھیر ہے کہ نظیر پر ثبوت شئی کو موقوف بتلایا جاتا ہے اور جس چیز کی نظیر نہ ملے اس کو خلاف عقل اور محال کہا جاتا ہے۔ لوگوں کو ثبوت کی حقیقت ہی معلوم نہیں۔ نظیر پر ثبوت کو موقوف سمجھتے ہیں۔

میں کہتا ہوں کہ جو صنائع اور عجائبات اس زمانہ میں ایجاد یا مشاہدہ ہوئے ہیں کیا اس زمانہ سے پہلے کسی کے پاس ان کی نظیر تھی اور اگر نہ تھی تو کیا اس وقت یہ خلاف عقل اور محال تھیں۔ اگر محال تھیں تو پھر آج ان کا وقوع کیونکر ہوا۔ معلوم ہوا کہ کسی شئی کا امکان نظیر کے ملنے پر موقوف نہیں تو خوب سمجھئے کہ کسی دعویٰ کا ثبوت نظیر کے ملنے پر موقوف نہیں بلکہ نظیر تو محض توضیح اور تزیین کے لئے ہوا کرتی ہے مدعی ثبوت کے ذمہ نظیر کا پیش کرنا ہرگز لازم نہیں خصوصاً ایسے مدعی کے ذمہ جو کسی امر کا ثبوت یہ کہہ کر کرتا ہو کہ یہ امر خلاف عادت بطور معجزہ کے واقع ہوا یا قیامت میں خلاف عادت یوں ہوگا اس ذمہ تو کسی قاعدہ سے بھی نظیر کا پیش کرنا لازم نہیں ہو سکتا۔ کیونکہ وہ تو اپنے دعویٰ میں تصریح کر رہا ہے کہ مدعا بے نظیری کی صفت کے ساتھ تصدق ہے اگر نظیر کا پیش کرنا مدعی کے ذمہ کسی درجہ میں لازم بھی ہو سکتا ہے تو صرف اس مدعی کے ذمہ ہو سکتا ہے جو اپنے دعویٰ کو موافق عادت بتلائے اور جو غرق عادت کا مدعی ہو اس سے نظیر کا مطالبہ کرنا عجیب ہے۔

اب میں آپ کو ثبوت کی حقیقت بتلاتا ہوں جس کے نہ ملنے لوگوں کا موجودہ ذوق

معراج کی نظیر کا سوال ہوتا ہے۔ شوق القہر کی نظیر کا مطالبہ ہوتا ہے۔ اس لئے یہ عقلی مسئلہ ہے کہ کسی خبر کا صحیح ہونا یا کسی امر کا واقع ہونا نظیر پر ہرگز موقوف نہیں چنانچہ جن کو عقلیات سے کچھ بھی مس ہے وہ اس کو جانتے ہیں مدعی اگر نظیر بیان کر دے تو یہ اس کا تبرع ہے بلکہ ثبوت خبر کے لئے دلیلی و دیکھی ضرورت ہے ایک خبر بکا ممکن ہونا دوسرے خبر کا محال ہونا۔ پس ہمارے ذمہ تمام معجزات اور

معادیات کے متعلق دو باتوں کا ثابت کرنا ہے ایک یہ کہ وہ فی نفسہ ممکن ہوں، دوسرے خبر صادقانے اس کے وقوع کی خبر دی ہو۔ ان دو باتوں کے ثابت کرنے کے بعد کسی کو انکار کا حق نہ ہوگا۔

دینی امور کی دلیل

اب ہم معراج وغیرہ اور صراط و وزن اعمال وغیرہ کے ثبوت پر دلیل قائم کرتے ہیں کہ یہ معجزات اور معادیات فی نفسہ ممکن ہیں۔ یہ تو دلیل کا پہلا مقدمہ ہے اگر کسی کو اس مقدمہ میں کلام ہو تو اس پر لازم ہے کہ ان کے امتناع پر دلیل قائم کرے اور ہم کو امکان پر دلیل قائم کرنے کی ضرورت نہیں ہے کیونکہ امکان کی کوئی علت نہیں ہوتی بلکہ امتناع پر دلیل نہ ہونا ہی امکان کی دلیل ہے اور اوپر معلوم ہو چکا ہے، کہ امتناع کہتے ہیں اجتماع نقیضین کو کہ محل واحد میں آن واحد میں جہت واحدہ سے ہو تو جس کو ان امور کے امکان میں کلام ہو وہ ثابت کرے کہ ان میں اجتماع نقیضین کس طرح لازم آتا ہے۔

دوسرا مقدمہ یہ ہے کہ جس امر ممکن کے وقوع کی خبر کوئی خبر صادقانہ دے وہ ثابت ہے اور ان معجزات و معادیات کے وقوع کی خبر خبر صادقانہ نے دی ہے۔ پس یہ امور واقع و ثابت ہیں۔ ان مقدمات میں اگر کوئی کلام کرے تو اس کا جواب ہمارے ذمہ ہے۔ بقیہ نظیر کا پیش کرنا ہمارے ذمہ نہیں

پل صراط پر چلنا

مثلاً اگر کوئی کہے کہ پل صراط پر چلنا عقل کے خلاف ہے سمجھ میں نہیں آتا تو میں کہوں کہ پل صراط پر چلنا کبھی نہیں آتا۔ اس میں کیا استحالة ہے کہ ایک تاریک چیز پر پیر آجائے۔ جب یہ محال نہیں اور خبر صادقانہ اس کے وقوع کی خبر دے رہا ہے تو پھر انکار کی کیا وجہ، اگر کوئی انکار کرے تو اس کو یہ حق تو ہے کہ امکان کو رد کرے اور امتناع کو ثابت کرے یا دوسرے مقدمہ میں کلام کرے کہ یہ خبر صادقانہ کی خبر نہیں۔ تو ہم دلیل امتناع سننے کیلئے تیار ہیں اور کلام اللہ کو کلام اللہ ثابت کرنا بھی ہمارے ذمہ ہے اور جب یہ دونوں باتیں ثابت ہو جائیں پھر ہم نظیر پیش کرنے کے ذمہ دار نہیں اور اگر نظیر ہم کو معلوم بھی ہو تب بھی نہ بتلائیں گے کیونکہ یہ ہمارے ذمہ نہیں کہ ہم اپنی سب معلومات آپ کو بتلا دیں۔ ہاں اگر تم یہ ثابت کر دو کہ مستدل کے ذمہ نظیر کا پیش کرنا ضروری ہے تو جب ثابت کر دو گے اس وقت دیکھا جائے گا۔ بدو ان اس کے ہم زمانہ کے ساتھ جواب نہ دیں گے۔ یہ عوام کو زیادہ تر جواب دینے والوں ہی نے خراب کیا ہے کہ وہ ہر بات میں تبرعاً نظیریں بیان کرنے لگے عوام سمجھے کہ یہ بھی عجیب کے ذمہ ہے تو میں اس کا فیصلہ کرتا ہوں کہ مستدل کے ذمہ یہ ہرگز نہیں اور جو دعویٰ لازم کا کرے وہ دلیل قائم کرے یہ ہے دلیل مطرد جو تمام معجزات و معادیات میں برابر چل سکتی ہے، اور جو دلیلیں آجکل بیان کی جاتی ہیں جن میں زیادہ

ترنظیر سے جواب دیا جاتا ہے وہ مطرد نہیں ہیں۔

اب میں عقلاً یہ بات ثابت کرتا ہوں کہ کسی واقعہ کا ثبوت نظیر پر موقوف نہیں

نہیں۔ تقریر اس کی یہ ہے کہ یہ ظاہر ہے کہ نظیر بھی ایک واقعہ ہے میں پوچھتا ہوں کہ اس کیلئے بھی نظیر کی ضرورت ہے یا نہیں۔ وعلیٰ ہذا۔ اگر ہر نظیر کے لئے نظیر کی ضرورت رہی تو تسلسل مستحیل لازم آئے گا اور نظیر سے ایک دعویٰ بھی ثابت نہ ہو سکے گا اور اگر جاکر ٹھیکہ دگے کہ اس نظیر کیلئے کسی نظیر کی ضرورت نہیں تو معلوم ہوا کہ کسی واقعہ کا ثبوت بدو ان نظیر کے بھی ہو گیا تو پہلے ہی کیلئے نظیر کی کیوں ضرورت ہے۔ اور جس طرح تم نے اخیر میں ایک واقعہ کو بلا نظیر مان لیا تو پہلے ہی کو بلا نظیر کیوں نہیں مان لیتے۔ غرض کسی دلیل سے مستدل کے ذمے نظیر کا بیان کرنا نہیں ہے ہاں اگر بیان کر دے تو یہ اس کی شفقت ہے اور اس کا موقع اس وقت ہے جب کہ سائل دلیل کے مقدمات پر کلام کرنے سے عاجز ہو جائے اور تسلیم کر لے کہ واقعی دلیل سے یہ دعویٰ ثابت ہو گیا اور مجھے اب انکار کا کوئی حق نہیں۔ اس وقت اگر عجیب تقریباً فہم کے لئے کوئی نظیر دیدے تو اس کا احسان ہے اور اگر وہ نظیر پر ثبوت دعویٰ کو موقوف بتلاتا ہے تو مستدل نظیر ہرگز نہ بتلائے بلکہ اس وقت علیٰ النظر کی دلیل مانگے۔

پل صراط کیا ہے

چنانچہ اس وقت میں ثبوت پل صراط پر دلیل قائم کر کے اس کی ایک نظیر تبرعاً بتلاتا ہوں۔ اول پل صراط کی حقیقت سمجھئے مگر یہ کہے دیتا ہوں کہ یہ مضمون ظنی ہے اس طور پر پل صراط کو سمجھنا واجب نہیں۔ اصل تو یہ ہے کہ آدمی بجلا پختہ عقیدہ رکھے باقی بعض طبائع ضعیف ہوتی ہیں۔ ان کے لئے میں یہ مضمون بیان کرتا ہوں اگر وہ اس طرح بھی پل صراط کو سمجھ لیں تو حرج کچھ نہیں مگر لازم بھی نہیں، لازم تو وہی اجمالاً مان لینا ہے۔ اس تنبیہ کے بعد کہتا ہوں کہ اول اس کی حقیقت سمجھو جس کے لئے اول یہ مقدمہ سنو کہ اس عالم کے سوا ایک عالم اور بھی ہے مسلمان تو اس کا انکار نہیں کر سکتے۔ اور مخالفین اگر انکار کریں تو ہمارے پاس ان کے جواب کے لئے وہی دلیل مطرد ہے جو اوپر مذکور ہوئی کہ دوسرے عالم کا ہونا ممکن ہے کسی کو امکان پر کلام ہو تو دلیل امتناع قائم کرے اور جس ممکن کی خبر خبر صادقانہ نے دی ہو وہ ثابت ہے۔ پس دوسرا عالم ثابت ہے اور خبر کے صادق ہونے کو ہم دلائل سے ثابت کر سکتے ہیں۔

دنیا میں اختلاف حالات

دوسرا مقدمہ سنئے کہ عالم کے اختلاف سے بعض احکام اور حالات بدل جاتے ہیں، اس کی بھی دلیل تو دی ہے جو مذکور ہوئی اور تقریب فہم کے لئے ایک نظیر بھی بتلاتا ہوں جیسے اقلیم کے بدلنے سے بھی دنیا ہی میں حالات بدل جاتے ہیں مثلاً یہاں اس وقت رات ہے اور ایک اقلیم میں اس وقت دن ہے یہاں آج کل گرمی ہے اور کسی اقلیم میں اس وقت سردی ہے علیٰ ہذا جو بیس گھنٹے کا دن رات ہے اور بعض اقلیم میں چھ مہینے کا دن اور چھ مہینے کی رات ہے، اور یہیں سے معلوم ہوا ہوگا کہ قرآن میں آج آیا ہے کہ عالم آخرت کا ایک دن ہزار برس کے برابر ہے اور اس پر بعض لوگ ہنستے ہیں تو یہ انکی حماقت ہے اس میں استبعاد کیا ہے جب عالم دنیا ہی میں اقلیم کے بدلنے سے یہ بات مشاہدہ ہے کہ بعض جگہ چھ ماہ کا دن ہوتا ہے تو اختلاف عالم کے بعد عالم آخرت میں اگر ہزار برس کے برابر ایک دن ہو تو کیا تعجب ہے۔

تیسرا مقدمہ یہ ہے کہ اختلاف کی کوئی حد نہیں ہے نہ یہ منضبط ہو سکتا ہے۔ یہ مقدمہ بدیہی ہے محتاج دلیل نہیں۔ اور جو شخص کسی حد پر انتہا اختلاف کا دعویٰ کرے اور اس سے آگے اختلاف ہونے کو متنع کہے وہ اس پر دلیل قائم کرے۔

چوتھا مقدمہ یہ ہے کہ ممکن ہے کہ جو چیز یہاں عرض ہو اس عالم میں جا کر جو ہر ہو جائے اس کا ممکن ہونا بھی ظاہر ہے یہ تو مسلم ہے کہ ایک آن اور ایک محل میں شے واحد عرض ہو نہیں سکتی مگر یہ ہو سکتا ہے کہ ایک شے یہاں عرض ہو اور دوسری جگہ جو ہر ہو جائے اس کے امتناع پر کوئی دلیل قائم نہیں۔ اگر کسی کے پاس دلیل پیش کرے اور استیناس کے طور پر اس کو یوں سمجھے کہ اس زمانہ میں بعض آلات کے ذریعہ سے حرارت و برودت وغیرہ کا وزن ہوتا ہے حالانکہ پہلے حکام ان کو مقولہ کیفیت سے سمجھتے تھے جس کے لئے وزن اور مقدار نہیں ہو سکتی مگر اس زمانہ میں ان کے لئے وزن ہونا ثابت ہو گیا۔ اس لئے میں تو کہتا ہوں کہ جتنی یہ نئی ایجادات ہیں سب معادیات کے سمجھنے کیلئے معین و مدد ہیں چنانچہ گراموفون ہاتھ پیر کے بولنے پر بڑی دلیل ہے کیونکہ گراموفون میں تو روح بھی نہیں اور کلام کرتا ہے تو عظام انسانی کے بولنے میں کیا تعجب جن میں حیات کا تلبس ہے۔

ایک حدیث کی تشریح

اسی طرح ایک حدیث میں ہے جو نسانی میں موجود ہے کہ حضور صلی اللہ علیہ وسلم نے صلوٰۃ کسوف کے موقع پر فرمایا کہ میں نے مسجد کی دیوار کے قریب جنت و دوزخ کو دیکھا۔ بعض لوگ اس پر ہنستے تھے کہ جنت و دوزخ تو آسمان

وزمین سے بڑی بتلائی جاتی ہے حضور نے انکو دیوار پر کیونکر دیکھ لیا اور اصلی حالت پر کیسے دیکھ لیا۔ مگر خدا تعالیٰ نے فوٹو اور خوردبین کو ایجاد کر کے اس استبعاد کو دور کر لیا۔ فوٹو میں بڑی سے بڑی شے کو چھوٹا کر کے دکھایا جاسکتا ہے اور خوردبین سے چھوٹی سے چھوٹی چیز پہاڑ بنا کر دکھائی جاسکتی ہے تو خدا تعالیٰ کو یہ قدرت نہیں کہ اس نے جنت و دوزخ کا فوٹو مسجد کی دیوار پر اتار دیا ہو اور حضور صلی اللہ علیہ وسلم کی شفاعت میں خوردبین کی قوت رکھ دی ہو جس سے فوٹو کی چھوٹی چیزیں آپ کی اصلی حالت پر نظر آگئی ہوں اور حدیث میں یہی لفظ وارد ہے امتثلت لی الجنة والنار، فرمایا کہ جنت و دوزخ زمین میں اتر آئی تھیں بلکہ آپ نے یہ فرمایا کہ وہ میرے لئے مثل ہو گئیں۔ اسی لئے جب کوئی نئی ایجاد ہوتی ہے تو میں خوش ہوتا ہوں۔ کیونکہ ان سے شرعیات کا استبعاد دور ہوتا جاتا ہے چنانچہ ایک عجیب بات اس زمانہ میں یہ ہے کہ آج کل حرارت و برودت کا بھی وزن ہونے لگا ہے کہ اس مکان میں کس قدر وزن کی حرارت موجود ہے اور کس درجہ کی برودت ہے اور بخار میں تھرما میٹر سے مریض کی حرارت کا وزن کیا جاتا ہے۔ اب اگر کسی گنوار سے کہئے کہ گرمی بھی تلی ہے تو اسکو کتنا تعجب ہوگا۔

تو جب دنیا ہی میں بعض اعراض کا وزن ہونے لگا جس کی حقیقت ہے بلکہ وزن کے انحصار اور ارتقاع سے مقدار کا معلوم ہو جانا جو کہ سرسری نظر میں خواص جوہر سے ہے تو اگر دوسرے عالم میں جا کر وہ جوہر ہی بن جاوے تو کیا تعجب ہے۔ اور لیجئے۔ اگر ایک برتن ٹھنڈا پانی بھر کر وزن کرو تو اور وزن ہوگا اور اسی میں گرم پانی بھر کر وزن کرو تو اور وزن ہوگا۔ آخر کی بیشی کیوں ہے پانی کی مقدار دونوں حالتوں میں یکساں تھی۔ معلوم ہوا کہ برودت و حرارت کا بھی کچھ وزن ہے۔ اب خواہ اس کو یوں تعبیر کر لیجئے کہ وزن پانی ہی کا ہے مگر بشرط برودت و حرارت کے آفران کو وزن میں دخل تو ہوا۔ تو اس عالم میں اگر یہی دخل درجہ موزونیت میں اس طرح ہو جائے کہ یہ عرض جوہر بن جاوے تو کیا تعجب ہے۔ اور سنئے! اطباء کہتے ہیں کہ جس شخص میں صفراء کا غلبہ زیادہ ہو وہ خواب میں آگ بہت دیکھتا ہے۔ دیکھئے جو چیز یہاں عرض تھی یعنی حرارت صفراء وہ عالم خیال میں آگ بن گئی جو کہ جوہر ہے پس اس عالم میں عرض کا جوہر بن جانا کچھ بعید نہیں۔

اب پل صراط کی حقیقت سمجھئے کہ اس کے بیان کرنے کی ضرورت نہیں کیونکہ مسلمان کا مذاق تو یہ ہونا چاہئے۔

حدیث مطرب دے گو داز دہر کم تر جو : کہ کس نہ کو نہ کشاید بہ حکمت این معمّار

اور میں کہہ چکا ہوں کہ میرے ذمہ اس کا بیان کرنا لازم نہیں، میرے ذمہ تو وہی تھا جو میں بیان کر چکا ہوں مگر اس میں حط نہ آیا تھا، اس لئے تبرئاً بیان کرتا ہوں کہ خیر جس طرح بھی کام چلے اچھا ہے۔

تو سنے! پہل صراط کی حقیقت شریعت ہے دیکھا قال اصحاب الکشف من العرفاء، پس دنیا میں پہل صراط کی نظیر شریعت موجود ہے اتنا فرق

شریعت پر عمل

ہے کہ یہاں یہ عرض ہے اور وہاں جا کر جو ہر بن جائے گی، باقی ان تمام صفات میں یہ اس کی نظیر ہے جیسے وہ بال سے باریک اور تلوار سے تیز ہے جس پر چلنا دشوار ہے۔ اسی طرح طریق شریعت تھا باریک اور نازک ہے جس پر استقامت کے ساتھ چل لینا ہر ایک کا کام نہیں کیونکہ شریعت مقدسہ مرکب ہے علم و عمل سے تو اس پر چلنے کیلئے دو قوتوں کی ضرورت ہے ایک قوت علمیہ کی، دوسری قوت علمیہ کی۔ قوت علمیہ کا تعلق عقل سے ہے اور قوت علمیہ کا ارادہ سے۔ پھر عمل بعض مفید ہیں اور بعض مضر تو اس میں کہیں تو جلب منفعت کی ضرورت ہے اور کہیں دفع مضرت کی اور جو ارادہ جلب منفعت سے متعلق ہو اس کو قوت شہویہ کہتے ہیں اور جو دفع مضرت کے متعلق ہو اس کو قوت غضبیہ کہتے ہیں تو شریعت پر چلنے کیلئے تین قوتوں کی ضرورت ہوئی۔ قوت عقلیہ، قوت شہویہ، قوت غضبیہ۔

یہی اصول اخلاق کہلاتے ہیں۔ پھر ان میں سے ہر ایک کے تین درجے ہیں۔ افراط، تقریط اور توسط۔ اور شریعت نام ہے توسط کا۔ شریعت میں افراط عقل سے کام نہیں چلنا تقریط سے کام چلنا ہے بلکہ توسط کی ضرورت ہے جس کا نام حکمت ہے اور قوت عقلیہ کا نام جزیرہ ہے یہ نہایت مضر ہے۔ جب عقل بہت بڑھ جاتی ہے تو ہر چیز میں احتمالات عقلیہ پیدا ہونے لگتے ہیں جس سے آدمی وہمی ہو جاتا ہے جیسے اہل فلسفہ میں ایک فرقہ لااوریث مشہور ہے کہ وہ کسی حقیقت کا وجود تسلیم نہیں کرتے اور کہتے ہیں کہ بہت دفعہ ایسا ہوتا ہے کہ ہم ایک چیز کو دو سے دیکھ کر آدمی سمجھتے ہیں اور وہ گدھا نکلتا ہے۔ بہت لوگ ایک شخص کو حسین سمجھتے ہیں اور بہت سے اس کو بد صورت سمجھتے ہیں۔ بعض لوگ ایک چیز کو میٹھا بتلاتے ہیں اور بخار والا اس کو کڑوی بتلاتا ہے اسی طرح مسائل عقلیہ میں کوئی ایک دلیل کو صحیح کہتا ہے کوئی غلط۔ تو جب ہمارے حواس ظاہرہ اور باطنہ میں اتنا اختلاف ہے اور کبھی ان سے غلطی بھی ہو جاتی ہے، تو کیا اطمینان ہے کہ جس کو ہم نے آدمی سمجھا ہے وہ آدمی ہی ہے گدھا نہیں اور جس کو ہم زمین سمجھتے ہیں وہ زمین ہی ہے آسمان نہیں۔ ممکن ہے ہماری نظر نے غلطی کی ہو۔

بس ان کا یہ حال ہو گیا کہ ہر بات میں ان کو شک ہے اور شک میں بھی شک ہے

فہو شاک و شاک فی اتما شاک۔

عقل کی مثال

تو حضرت یہ عقل جب بڑھتی ہے تو اتنا پریشان کرتی ہے کہ زندگی تباہ کر دیتی ہے اور یہی وجہ ہے بہت سے عقلاء کے تباہ ہونے کی، کہ انھوں نے عقل سے وہ کام لیا جو اس کی حد سے آگے تھا اور ہر چیز کا اپنی حد سے آگے نکل جانا مضر ہے۔ میں نے عقل کے متعلق ایک مثال دیا کرتا ہوں کہ یہ ایسی ہے جیسے گھوڑا پہاڑ پر چڑھنے والے کے لئے۔ اب تین قسم کے لوگ ہیں ایک تو وہ جو گھوڑے پر سوار ہو کر پہاڑ تک پہنچے اور پھر پہاڑ پر بھی اس پر سوار ہو کر چڑھنے لگے یہ غلطی پر ہیں۔ ضرور کسی سیدی اور چڑھائی پر سوار اور گھوڑا دونوں گریں گے، اور ایک وہ ہیں جو یہ سمجھ کر کہ گھوڑا پہاڑ پر تو کام دیتا ہی نہیں تو اس سے صاف نترک کر بھی کام لینے کی کیا ضرورت ہے وہ گھوڑے سے پیدل چل پڑے، نتیجہ یہ ہوا کہ پہاڑ تک پہنچ کر تھک گئے یہ بھی نہ چڑھ سکے تو ان دونوں کی رائے غلط تھی۔ پہلی جماعت نے گھوڑے کو ایسا باکار سمجھا کہ اخیر تک اسی سے راستہ طے کرنا چاہا اور دوسرے ایسا بیکار سمجھا کہ پہاڑ تک بھی اس سے کام نہ لیا۔ صحیح بات یہ ہے کہ گھوڑا پہاڑ تک تو کارآمد ہے اور پہاڑ پر چڑھنے کے لئے بے کار ہے اس کے لئے کسی اور سواری کی ضرورت ہے۔ یہی عقل کا حال ہے کہ عقل سے بالکل کام نہ لینا بھی حماقت ہے اور اخیر تک کام لینا بھی غلطی ہے۔

پس عقل سے اتنا کام تو کر کہ تو حید و رسالت کو سمجھو اور کلام اللہ کا کلام اللہ ہونا معلوم کر لو۔ اس سے آگے فردع میں عقل سے کام نہ لینا چاہئے، بلکہ اب خدا اور رسول کے احکام کے آگے گردن جھکا دینی چاہئے، بلکہ اب خدا اور رسول کے احکام کے آگے گردن جھکا دینی چاہئے چاہے انکی حکمت عقل میں آوے یا نہ آوے۔

قانون سلطنت کیوں مانتے ہیں

دیکھئے قانون سلطنت کے منوالے کی دو صورتیں ہیں ایک یہ کہ پہلے یہ سمجھا دیا جاوے کہ جابر پنجم بادشاہ ہے۔ اس کے بعد تمام احکام کے متعلق یہ کہہ دیا جاوے کہ یہ بادشاہ کے احکام ہیں اسلئے ماننا پڑیں گے تو یہ صورت آسان ہے اور تمام عقلاء ریا سا ہی کرتے ہیں۔

دوسری صورت یہ ہے کہ ایک شخص جابر پنجم کو بادشاہ مان کر پھر بھی ہر قانون میں الجھنے لگے کہ میں اس دفعہ کو نہیں مانتا۔ تو بتلائیے اس شخص کا کیا حال ہوگا۔ ظاہر ہے کہ ہر جگہ ذیل ہوگا اور عقلاء کہیں گے کہ جب بادشاہ کا بادشاہ ہونا مسلم اور اس قانون کا قانون سلطنت